جنس اور وجود

انیس ناگی

جنس اور وجود

انیس ناگی

جمالیات، لاہور
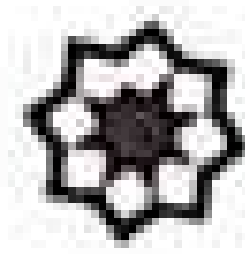
ناشر جمالیات

۲۲ گنگا رام مینشن، مال روڈ لاہور

طابع ندیم یونس پرنٹرز، لاہور

سال اشاعت ۲۰۰۲

قیمت 80 روپے

فہرست
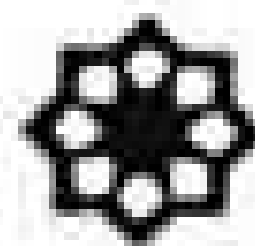
دیباچہ

انیس ناگی نے ان آٹھ مضامین میں عورت کے حوالے سے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن سے ہمارا اکثر بلا یا بالواسطہ سامنا ہوتا ہے۔ اور جن سے بوجوہ صرف نظر میں عافیت سمجھی جاتی ہے۔

انیس ناگی کی یہ تحریریں، احساس ہوتا ہے، کہ بہت توجہ اور سنجیدگی سے لکھی گئی ہیں، اور عمیق، بے حد تجزیاتی اور پر مغز ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے موضوعات پر کھلے اظہار کے لئے ایک جرات رندانہ درکار ہے جو شاید مصلحتاً کم کم پائی جاتی ہے۔ ممتاز مفتی سے ضمیرالدین سے ہوتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر تک عورت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن محدود انداز میں (اور زیادہ تر فرائیڈین فیشن میں) جزویاتی ٹریٹمنٹ میں بعض کوششیں کامیاب رہی ہیں۔۔۔ منٹو اپنے ویژن کے باعث یکتا ہے۔

انیس ناگی نے پاکستانی عورت کی جنسیات کو سمجھنے کے لئے کسی حد تک کلینکل انداز اختیار کیا ہے لیکن کنسے کی طرح (رپورٹ ساٹھ کی دہائی، امریکی مرد اور عورت کی نفسیات) اعداد و شمار کی بھرمار سے گریز کیا ہے۔ اپنے عمیق مطالعے اور زندگی کے معاملات کی گہری بصیرت کی وجہ سے انیس ناگی کے یہ مضامین اپنے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے وسیلے سے پاکستانی عورت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے "جنس اور وجود" اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں پاکستان کی تمدنی حالت میں پاکستانی عورت کا وجودی مطالعہ کیا گیا ہے۔

بعض ایک این جی اوز حقوق نسواں کی پر شور و زور چمپئن سمجھی جاتی ہیں لیکن شاید انہوں نے پاکستانی عورت کی مجموعی صورتحال کو گہرے تجزیاتی حوالوں سے سمجھنے سے گریز کیا ہے کہ وہ تمام کارروائی مغربی طرز احساس کے تحت سرانجام دیتی ہیں۔ ان کے مغربی ڈونرز کو بس اتنا ہی چاہئے ہے

انسان اعصابی تاروں میں گندھا ہوا ایک ایسا معجزہ ہے جس کی شخصیت کی تشکیل میں خاصے پیچیدہ عناصر اپنی تمام تر پیچیدگیوں سمیت بھرپور طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بچپن کے تجربات، ماحول، معاشیات، عمرانیات، مذہب، تاریخ، اور پھر جینیز۔۔ سب مل جل کر انسان کی کیمسٹری کو متعین کرتے ہیں۔ انسانی بائیو کیمسٹری عمل رد عمل کے چکر سے بنتی ہے جو اس کے جنسی، نفسیاتی اور اور سماجی وجود کی تشکیل کرتی ہے۔

پاکستانی عورت دوہرے جبر اور استحصال کا شکار ہے۔۔ اس کے اپنے کنبے۔۔-باپ، بھائی، خاوند، بیٹا) اور دوسرے بیرونی عناصر کا جبر و استحصال، جس کا مرد خود بھی شکار ہے۔

انیس ناگی پاکستانی عورت کی فارمولیشن میں خاصا بلکیت کا شکار دکھائی دیتا ہے کہ اسے منزل مقصود کے حصول کے لئے سر توڑ جد و جہد کے امکانات نظر نہیں آتے۔ بعض جگہ اس کے ساتھ اختلاف کی گنجائش بھی ہے لیکن مجموعی طور پر یہ مضامین سوچ کی ایک نئی راہ (اور منزل) متعین کرتے ہیں۔۔ مختصر اور کسے ہوئے یہ مضامین ''صاحب حال'' لوگوں کے لئے کوزوں میں دریا بند ہیں۔ صاحبان عمل کے لئے سیٹر یٹجی اور ٹیکنکس کے دروازے وا کرتے ہیں۔۔۔ اور صاحبان قلم. کے لئے بھی دعوت عام ہیں کہ وہ ان مضامین سے شعر و ادب کے حوالے سے ادارک کی کس سطح پر استفادہ کرتے ہیں۔

انور سجاد

لاہور جولائی ۲۰۰۲

پاکستانی عورت کی صورتحال

پاکستان میں عورتوں کی سماجی حالت' ان کی بیروزگاری اور ان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر(جو اس وقت کم و بیش پچاس فیصد تک پہنچ چکی ہے) پاکستانی عورت ایک نئے دو راہے پر کھڑی ہے۔ وہ یونیورسل عورت کے روپ سے تنگ آ چکی ہے' وہ عمل کی دنیا میں آکر اپنے لئے بعض نئے اور بعض پرانے حقوق کا مطالبہ دبے الفاظ میں کر رہی ہے۔ اس موضوع پر ڈائیلاگ ضروری ہے لیکن اس سے دانستہ گریز کیا جا رہا ہے کیونکہ عورت کی بحالی پاکستانی معاشرے کے ایجنڈے میں شامل نہیں ہے۔ یہ ڈائیلاگ شروع کرنے سے پہلے عورت کے بارے میں بعض تصورات اور مفروضوں کا اجمالاً ذکر بھی ضروری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عورت اور مرد زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں لیکن یہ پہیے شور زیادہ مچاتے ہیں اور چلتے کم ہیں۔ اس لئے کہ یہ دو الگ الگ وجود ہیں اور ایک دوسرے کے لئے غیر ہیں' وہ ایک دوسرے کی داخلیت میں نہیں اتر سکتے اس لئے وہ سرسری یا گہری واقفیت کے باوجود ایک دوسرے کے لئے اجنبی رہتے ہیں۔ عورت اور مرد ایک دوسرے کا تضاد ہیں اس لئے ان کے درمیان مرئی یا غیر مرئی طور پر dialectical عمل چلتا رہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو مسخر کرنا چاہتے ہیں' تسخیر دوسرے کا انہدام ہے۔ جب یہ عمل کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا تو پھر لاتعلقی جنم لیتی ہے۔ یہ وہ رخنہ ہے جو عورت اور مرد میں رفاقت کے دائمی تعلق کو لایعنی بنا دیتا

ہے۔ مرد اور عورت اس لا یعنیت کو قبول کر کے بھی اکٹھے زندہ رہنے کا بہانہ کرتے ہیں، کبھی شادی کر کے اور کبھی شادی کے بغیر کبھی وہ اولاد کے کے لئے منتیں مانتے ہیں اور کبھی اسے وبال سمجھتے ہیں۔

مرد اور عورت کی بیالوجی نے انہیں الگ کر کے ایک دوسرے کا محتاج بنا دیا ہے۔ مرد طبعاً جارح ہوتا ہے جبکہ عورت اپنے بدنی نظام کی وجہ سے مفعولیت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ عورت کا جسمانی نظام کمزور ہوتا ہے اس لئے مرد عورت کو اپنی حاکمیت میں رکھنا چاہتا ہے۔ عورت کمزور سہی اس کے سو چلتر ہوتے ہیں جو بیڈ روم سے ایوان اقتدار تک متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ عربی زبان میں عورت کے لئے فتنہ کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک عورت ایک بحران ہے 'ترغیب اس کا سب سے بڑا جادو ہے۔ شاید اسی باعث آدم کو جنت سے نکلنا پڑا تھا۔ عورت کو اس کی حد میں رکھنے کے لئے اساطیر' مذاہب اور انسانی فکر نے طرح طرح کے ضابطے بھی بنائے ہیں لہٰذا ہوا یوں کہ انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں ان ضابطوں کے نام پر کلیساؤں' مذہبی راہنماؤں' بادشاہوں' اور امرا نے عورت پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے اس کی آزادی سلب کرنے کے لئے بہت کچھ کیا۔اس طرح عورت کو انسان کا درجہ دینے سے گریز کیا گیا۔ اسے لذت اور محنت کا ایک ذریعہ سمجھا گیا' اس کی کارکردگی کو گرہستی تک محدود رکھا گیا۔ مردوں کی چیرہ دستیوں کے بارے میں یہ مشاہدہ تاریخی صداقت کا حامل ہے۔

گزشتہ صدی میں امریکہ اور یورپ میں حقوق نسواں کی بہت سی تحریکیں چلیں، بہت سا ادب بھی تخلیق ہوا اور بہت سی انجمنیں بھی بنائی گئیں۔ لطف کی بات ہے کہ ان انجمنوں کو مرد ہی چلاتے رہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک پدری نظام کا نتیجہ ہے جس میں عورت کو مرد کا محتاج بنایا گیا ہے۔۔ چلئے ہم یہ بات مان لیتے ہیں۔ لیکن یہ بات اتنی سیدھی نہیں ہے کیونکہ اس میکنزم کے پیچھے بہت سے ایسے لاینحل مسائل ہیں جن سے جدید پاکستانی عورت روبرو ہے۔ پاکستانی معاشرہ دنیا کے

چند غیر معمولی معاشروں میں سے ہے جو دانستہ طور پر علم اور بے خبری، جھوٹ اور سچ کے درمیان رہنا چاہتا ہے کیونکہ یہ آئینے کی معروضیت سے محروم ہے جو اصل چہرہ دکھاتا ہے۔ یہ کیسے مان لیا جائے کہ عملی سطح پر ہم ایک ٹیکنولوجیکل دور سے گزر رہے ہیں اور اس سے پیدا ہونے والے شعور سے بے شعور ہیں، ہم مینکیور 'پیڈیکیور' بالوں کی رنگ برنگیاں ڈایاں ' بھارتی فلموں کے فیشن وغیرہ وغیرہ کے بارے میں سب کچھ جانتے لیکن جب انفرادی اور اجتماعی شناخت کا مسئلہ ہو تو ہم بدھو بن جاتے ہیں۔ پاکستانی عورت زندگی کے ہر معاملے میں گومگو کے عالم میں ہے، وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ دوسرے اس کے لئے فیصلے کرتے ہیں۔ وہ ابھی تک صرف اپنیsexuality کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پاکستان کی آبادی کا نصف حصہ جو عورتوں پر مشتمل ہے اس کا واحد مشغلہ اولاد پیدا کرنا ہے۔ لیکن وہ جن اقتصادی اور جذباتی الجھنوں میں محصور ہے اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ جب بھی عورت کا مسئلہ ہو ہم جھٹ سے اسے مذہبی معاملہ بنا دیتے ہیں ۔ عورت کی بحالی کے نام پر پاکستان میں غیر ملکی امداد سے چلنے والی این جی اور پاکستانی عورت کے مسائل کی شناخت نہیں کر سکیں۔ کیونکہ ان کا ہدف کچھ اور ہے۔ان کی سربراہ متمول طبقے کی ناراض اور مرد دشمن خواتین ہیں جو خوشحال زندگی بسر کرنے کے بعد معاشرتی امتیاز حاصل کرنے اور وقت کاٹنے کے لئے نسائیت اور انسانی حقوق کا کبھی کبھار چرچا کرتی ہیں۔ ان کا پاکستان کی اصل عورت سے رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ عورت کے بارے میں رائے عامہ میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکی ہیں۔ چولہا پھٹنے یا کم جہیز ملنے پر عورت کی درگت بنانا تو محض مظاہر ہیں جن کے عقب میں ایک معاشرتی رویے کی داستان ہے جسے ایشوز میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔پاکستان کی اصل عورت وہ ہے جو نادار ہے، جو تنگ معیشت میں شب و روز کاٹ رہی ہے، جو مرد کی جنسی غلامی میں سوچے سمجھے بغیر نصف درجن سے زیادہ بچے پیدا کرنے پر مجبور ہے۔ پاکستان کی اصل عورت ایک مشقتی ہے جو

معاشرتی رسوم کی غلام ہے۔ پاکستان کی اصل عورت وہ تعلیم یافتہ ہے جو گھر میں
ایک مدت سے شوہر کے انتظار میں بوڑھی ہو جاتی ہے اور جس کا ذریعہ آمدنی
بوڑھے والد کی پنشن ہے۔ پاکستانی عورت کی یہ صورتحال تشویشناک ہے۔ پاکستانی
سوسائٹی داخلی طور پر heterogen us ہے' اس لئے پاکستانی عورت کے مسائل
اس کی طبقاتی صورتحال سے مرتب ہوتے ہیں

ہبوط آدم سے لے کر آج تک عورت کسی نہ کسی سطح پر ایک مسئلہ رہی ہے۔
ہر اہم مذہب نے اسی لئے عورت کو اپنا موضوع بنایا ہے ۔۔ اگر مرد اور عورت
دونوں انسان کے زمرے میں آتے ہیں تو پھر عورت کیوں کر ایک مسئلہ ہے؟ مسئلہ
یامسائل تو مردپیدا کرتا ہے۔ مرد ہمیشہ اختیار چاہتا ہے خواہ وہ باورچی خانے کا ہو یا
ایوان صدارت کا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایک انسان ہونے کے ناطے عورت بھی
مرد کی طرح کھاتی پیتی ہے' پڑھتی لکھتی ہے' خواہشیں رکھتی ہے مرد عورت کے
پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر عورت کے پیٹ سے ہی افزائش نسل کرتا ہے۔۔
اس کے خانگی نظام میں ادھر ادھر عورتیں ہیں' ان کے ساتھ شب و روز رہتے
ہوئے بھی اجنبیت کیوں ہے؟ یونانی کہتے تھے کہ عورت humanoid ہے۔ یعنی
وہ انسانوں کی طرح ہے۔ عورت کا بدنی نظام مرد سے کلیتہً مختلف ہے وہ بلوغت کے
جن مراحل سے گزرتی ہے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اس کے بدن کی ساخت اور
اندرونی metabolism اسے مرد سے مختلف بنا دیتا ہے۔ وہ طبعاً introvert
داخلیت پسند' پراسرار' نرگسیت پسند' بردبار لیکن جذباتی اور منتقم مزاج ہوتی ہے۔
یہ اس کی بیالوجی کا نتیجہ ہے یا اس کے ماحول کا اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ
نہیں کہا جا سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ انسانی نظام میں عورت کا عورت ہونا ہی مسئلہ
ہے۔ یعنی دوسری جنس میں جنم لینا اس کے مقدر کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ نہ چاہتے
ہوئے بھی عورت ہونے پر مجبور ہے۔ عورت میں افزائش نسل کی صلاحیت اسے
مرد سے مختلف کرتی ہے۔ یہ افزائش نسل جنسی عمل کے ذریعے ممکن ہے اور اس

عمل میں لذت کا پہلو بھی ہے۔ جب افزائش نسل کو اس میں سے منہا کر دیا جائے تو بہت سی انفرادی اور معاشرتی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر بقول فرائیڈ اصول لذت ہی محرک حیات ہے تو پھر مذاہب کا اس موضوع میں در آنا ضروری ہے کیونکہ لیبڈو اور آئیڈ میں اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے بیحد قوت ہوتی ہے' یہ اپنے بہاؤ میں کسی اخلاقی قدر اور ضابطہ کو نہیں دیکھتی۔ اس کی سب سے بڑی مثال عام حالات میں' جنگوں یا فسادات میں عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کی واردات ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ عورت کو ایک کمتر نوع سمجھے جانے کے باوجود حرمت کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ ہیلن آف ٹرائے کا واقعہ ہو یا پنجاب کے گاؤں کا کوئی آدمی ہو وہ عورت کی خاطر لہو بہانے میں دریغ نہیں کرتا۔ آپ اسے مرد کے رویے کی ثنویت بھی کہہ سکتے ہیں۔

عورت کا مسئلہ بیک وقت ایک انسانی اور اخلاقی مسئلہ ہے۔ انسانی حقوق کے حوالے سے یہ انسانی مسئلہ ہے کہ عورت کو وہی مساواتی حقوق دیئے جائیں جو مرد کے لئے مخصوص ہیں۔ دوسری طرف مرد اور عورت کے تعلق کی بنیاد جنس sex پر ہے' انسان کو بے اعتدالی سے روکنے کے لئے اخلاقیات کو ضروری تصور کیا گیا ہے لیکن کوئی اخلاقی نظریہ کسی مذہبی تعلیم کی پشت پناہی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جنس کے حوالے سے ہندومت اور اسلام دو ایسے مذاہب ہیں جنہوں نے مرد اور عورت کی جنسی جبلت اور ان کے حقوق کے بارے دو مختلف نقطہ ہائے نظر کو پیش کیا ہے۔ ہندومت کی تاریخ میں دیوتا اور دیوی کے جنسی عمل سے کائنات نے جنم لیا تھا۔ کسی زمانے میں ہندوستان میں عورت اور آدمی کے جنسی اعضا کی پوجا کی جاتی تھی اور آج بھی ان بتوں کی تمثالیں بھارت میں موجود ہیں۔ ہندوؤں میں آزادانہ جنسی عمل کی اجازت تھی بلکہ ان کی داستانوں اور فوک لور میں اجتماعی جنسی عمل collective orgies کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ ولہم رائخ جنسی عمل میں جس orgasam کا ذکر کرتا ہے وہ لذت کا انتہائی مقام ہے جہاں انسان ایک نئی دنیا میں

داخل ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے جنسی شاستر کاما سوترا وغیرہ عورت کی جنسی جبلت یا رویے کی وضاحت کرنے کی بجائے جنسی لذت حاصل کرنے کے داؤ پیچ بتاتے ہیں جو ہمیں عورت کو سمجھنے میں مدد نہیں دیتے۔

نفسیات کے علم میں سگمنڈ فرائیڈ کو اساسی حیثیت حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے سائنسی بنیادوں پر انسان کا مطالعہ اس کی جنسی جبلت کے حوالے سے کیا کہ یہ محرک حیات ہے اور اس کا عدم اطمینان بہت سی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کا باعث بنتا ہے۔ فرائیڈ نے انسان کی ذات میں ہر قسم کے اسرار اور تمام غیبی قوتوں سے انکار کرتے ہوئے اس کا تجزیہ ایک خود کار ذہن اور بدن کے طور پر کیا۔ جنس فرائیڈ کا بنیادی موضوع تھا۔اس نے عورت کا مطالعہ اس کے بدن کی خواہشات کے حوالے سے کیا ہے۔ عورت کے بارے میں فرائیڈ کی سوچ چند ایک نکات پر جمی رہی۔ وہ ہر جگہ عورت مں اڈی پس کمپلیکس اور جنسی casteration کے احساس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس کے مطابق عورت جنس کے علاوہ کچھ نہیں ہے' وہ اس کی ذہنی زندگی کو قابل توجہ نہیں سمجھتا۔ فرائیڈ کی نسبت ایڈلر کا رویہ زیادہ متوازن ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ عورت کی sexuality کا مطالعہ اس کی کل شخصیت کے حوالے سے کرنا چاہیئے۔ بیسویں صدی میں فوکو' رائخ اور سیمون دی بوار ایسے جید مفکروں اور ادیبوں نے عورت کی جنس' اس کے حقوق اور آزادی کی خواہش کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی کے پاس عورت کی زندگی کو آسان بنانے اور اسے مرد کے برابر رتبہ دینے کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔

کہنے کو تو سب انسان ایک جیسے ہیں اور تمام کی جبلتیں ایک جیسی ہیں' لیکن جبلتوں کے اظہار اور رویوں کی تشکیل ایک کلچرل پیٹرن کے اندر ہوتی ہے۔ یہیں سے انسان کے شعور اور لاشعور میں تصادم کی ابتدا ہوتی ہے۔ پاکستانی کلچرل پیٹرن تضادات کا مجموعہ ہے۔ معاشرہ شعوری سطح پر معاشرتی اور اخلاقی اقدار میں تغیرات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ ہم آج بھی ان اقدار اور معیاروں کی تلقین

کرتے ہیں جن کی validity مشکوک ہو چکی ہے۔ آج کا معاشرہ پاکستانی عورت کیلئے جو راہ عمل تجویز کرتا ہے وہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے' وہ اپنی جداگانہ entity چاہتی ہے جو مرد کے زیر بار نہ ہو۔

پاکستان مسائل سے لدا ہوا ملک ہے' ان میں ایک بے حد اہم مسئلہ عورت کی موجودہ صورتحال ہے۔۔ پاکستانی عورت کا تشخص کیا ہے؟ یہ خود اسے معلوم نہیں ہے اور نہ ہی نسائیت کی علمبردار خواتین کو جو بذات خود بہت سے مسائل کا شکار ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ پاکستانی مرد عورتوں پر نفسیاتی تشدد کرتا ہے' اسے مارتا پیٹتا ہے' اسے چولہا پھٹنے کے بہانے زندہ جلا دیتا ہے' ان مظالم میں ساس اور بیٹے دونوں کا اشتراک ہوتا ہے۔ کھانے پینے' معاشرتی تعلقات اور ہر معاملے میں عورت کو پیچھے رکھا جاتا ہے اور اُس سے انسانی سلوک نہیں کیا جاتا' اسے انسان کی بجائے عورت سمجھا جاتا ہے۔ اسے ملازمتوں سے دور رکھا جاتا ہے۔ خاوند کا جب جی چاہا اسے گھر سے بے عزت کرکے نکال دیا اور اس کے ساتھ تین چار بچوں کی پوٹ بھی باندھ دی۔ عورتوں کو یہ بھی شکایت ہے کہ مرد چاہے چار عورتوں سے ناجائز تعلقات قائم کرلے لیکن اگر بیوی مسکرا کر کسی غیر مرد سے بات کرلے تو اسے بدمعاشی اور بدکرداری کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ تعلیم کے فروغ اور الیکٹرونک میڈیا کے پھیلاؤ نے ہمارے خواندہ طبقے میں عورت کے تصور کو بدل دیا ہے۔ اب شہروں میں چادر میں لپٹی ہوئی شرماتی اور کم سخن عورت کو قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا۔ یہ درست ہے کہ مغربی تہذیب نے عورت کو بیحد آزادی دی ہے لیکن آزادی نسواں کی تمام تحریکیں وہیں سے شروع ہوئی ہیں۔ وہاں بھی عورت اتنی محفوظ نہیں ہے' مردوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے وہ اتنی ہی نروس ہوتی ہے جتنی پاکستانی عورت۔ کینڈی ہو یا کلنٹن ان کے اپنے عملے کی عورتوں سے سکینڈل تمام دنیا کو معلوم ہیں۔ سفید فام دنیا میں جنسی فعل کو انسانی بیالوجی کا ایک ناگزیر حصہ تصور کرکے اسے اخلاقیات سے الگ کر دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک شادی بیاہ یا بغیر شادی کے

عورت آدمی کا رہنا اور اس تعلق سے پیدا ہونے والے نتائج کا تعلق معاشرتی ذمہ داری سے ہے۔

انسان کی نشو و نما میں تاریخ اور کلچر کی جبریت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر انسان بنیادی طور پر ایک جانور ہوتا ہے جو کلچر اور تاریخ کی مدد سے اپنے آپ کو پاتا ہے یعنی وہ انسان کی نوع میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس لئے پاکستانی عورت کا مطالعہ ایک کلچرل تناظر میں کیا جانا ضروری ہے۔ انسان کے انفرادی اور اجتماعی مزاج میں مذہبی، کلچرل اور تاریخی روایات کا زیادہ عمل دخل ہوتا ہے۔ بچہ پیدائش کے عمل کے ذریعے بعض جنیاتی خصائص وراثت میں پاتا ہے باقی سب کچھ وہ اپنی پرورش اور ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ اس کے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہر طرح کے تعصبات اور معتقدات موجود ہوتے ہیں جس میں سے اس نے گزرنا ہوتا ہے۔ پاکستان کی عورت بھی ایک خاص جغرافیائی اور کلچرل Topography کی پیداوار ہے اس کا مطالعہ مغربی تمدن کے حوالے سے نہیں کیا جا سکتا تاہم اس کی صورتحال کا تقابل ضرور کیا جا سکتا ہے۔ مائیکرو سطح پر پاکستانی عورت کی مزید تقسیم کی جا سکتی ہے۔ شہری، دیہاتی اور طبقاتی۔ ابھی تک ہم شہری اور دیہاتی آبادی میں نفسیاتی، معاشرتی اور اقتصادی تقسیم کرتے رہے ہیں کہ دیہاتی آبادی ان پڑھ اور پس ماندہ ہے۔ یہ سوچ شہری مقتدر طبقے کی ہے جو دیہاتی آبادی کو غیر تربیت یافتہ محنت labour سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے کہ دیہی عورت کو اگر شہروں میں رہنا ہے تو اسے گھروں میں بطور ملازمہ کام کرنا ہے۔ اگر دیہاتی مردوں نے شہروں میں رہنا ہے تو انہوں نے مزدور اور کاریگر کے طور پر کام کرنا ہے۔ یہ نفسیاتی رویہ سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے جس میں شہری آبادی ایک آجر ہے۔ یہ سوچ یا یہ باتیں ایک فیوڈل نظام زندگی سے الہام لیتی ہیں لیکن باہر معاشرتی صورحال بدل چکی ہے۔ چنانچہ اب شہروں اور دیہاتیوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے، اب دیہاتی بھی صبح کے وقت لسٹرین مانگتے ہیں، لڑکیاں اور عورتیں بھی اب خوشبوؤں کی ضرورت

محسوس کرتی ہیں۔ کیبل نیٹ ورک بھی دیہاتوں میں جا پہنچا ہے جہاں دیہاتی بھارتی ناریوں کو انڈر ویر پہنے اچھل کود کرتی ہوئی دیکھتے ہیں' ان کے سامنے گوریاں کسی حجاب کے بغیر جھٹ پٹ کپڑے اتار کر مردوں کے ساتھ برملا جنسی عمل میں منہمک ہو جاتی ہیں۔ پاکستانی معاشرے کے شرفا ایسے مناظر دیکھ کر نگاہیں نیچی کر لیتے ہیں لیکن ٹیلیوژن کو بجھاتے نہیں۔ کیا ان عوامل و عواقب اور مظاہر نے معاشرت اور کلچرل اور احساسات کی سطح پر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے ؟ کیا ہم وہی ہیں جو ہم تھے؟ کیا ہمارے شعور اور ہماری سوچ میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ یقیناً آیا ہے لیکن ہم اس سے روبرو ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

اگر عورتوں نے برقعہ اتار دیا ہے' اور وہ دفتروں میں کام کرنے پر اصرار کرتی ہیں' وہ کھیلوں میں شریک ہوتی ہیں' او وہ شو بز میں کسی حجاب کے بغیر حصہ لیتی ہیں' تو ہم پشیمان کیوں ہوتے ہیں؟ اب طلاق کی بجائے خلع کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے' اب وہ زندگی کے کھیل میں برابر کا حصہ مانگتی ہیں۔ پاکستانی عورت اب یونیورسل عورت سے ایک عملی عورت بننا چاہتی ہے' وہ اپنی آزادانہ معیشت کی خواہشمند ہے۔ یہ مظاہر تغیر کے عمل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ پیش رفت عورتوں کی بجائے force of circumstances کا نتیجہ ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب تھیوری کی باتیں ہیں۔ اب بھی پاکستانی عورتیں شادی بیاہ کے لئے والدین کی ضرورت کو محسوس کرتی ہیں' اب بھی وہ شام کو اکیلی گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں' اب بھی مردوں کو دیکھتے ہی غصے سے تن کر ایک ناراض عورت کا روپ دھار لیتی ہیں' وہ مرد کو دیکھ کر ملائمت اور اپنی نسائیت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے ایک مخالف حریف بن جاتی ہیں' اگر کوئی مرد ان سے بات کرنے کی کوشش کرے تو ایک ہی جواب ملتا ہے " تمہارے گھر میں ماں بہن نہیں ہے"۔ یہ جملہ ایک سے زیادہ رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ اس کے متن text کے اندر اور بہت سے متن ہیں جو پاکستانی معاشرہ اور یہاں کی عورت کی نفسیاتی صورتحال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اس جملے میں اور متن بھی نکالے جا سکتے ہیں۔ اگر ان متون کی ہارا کی قائم کی جائے تو پاکستانی عورت کی ٹیڑھی سائیکی نظر آتی ہے۔ دراصل پاکستانی عورت مرد سے ڈائیلاگ کرنا نہیں چاہتی۔ وہ صرف شادی کا ڈائیلاگ چاہتی ہے۔

پاکستان عورت ایک بیحد خوف زدہ جنس ہے۔ اس کی پیدائش پر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا جاتا' ہر کوئی پہلی اولاد لڑکا چاہتا ہے۔ اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو نہ صرف اس کا باپ اور اس کے قریبی عزیز و اقارب کا منہ بن جاتا ہے بلکہ اس کو پیدا کرنے والی عجیب وغریب احساس کمتری اور کلیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ روز اول سے ہی لڑکی کو ایک بوجھ اور ذمہ داری تصور کیا جاتا ہے۔ پہلی لڑکی کی پیدائش کے بعد لڑکے کی پیدائش کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کوشش میں سات آٹھ لڑکیاں پیدا کی جاتی ہیں' اگر اتفاق سے لڑکا پیدا ہو جائے تو امید بر آتی ہے' اگر پیدا نہ ہو تو میاں بیوی تھک ہار کر اس کو قسمت کا فیصلہ تصور کر کے ایک نادار اور آبادی سے ابلتے ہوئے ملک میں مزید آبادی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ اتفاق سے یا حادثاتی طور پر سات لڑکیوں کا باپ انتقال کر جاتا ہے تو وہ عورت کے لئے ایک جیتا جاگتا جہنم چھوڑ جاتا ہے۔ لڑکے کی تمنا دو وجوہ کی بنا پر کی جاتی ہے۔ ایک مسئلہ جائیداد کی وراثت کا اور دوسرا protection کا کہ لڑکا بازو بنے گا' اکثر حالات میں یہ خوش فہمی غلط فہمی ثابت ہوتی ہے۔ پاکستانی والدین کی طرف سے اور خاص طور ماں کی طرف سے لڑکی پر دوسری جنس ہونے کا بوجھ ضرورت سے زیادہ لاد دیا جاتا ہے۔ ابھی اس کا بدن پھوٹنے والا ہوتا ہے تو اس کی شادی کے بارے میں سوچیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ماں اس کی چوری چھپے نگرانی کرنے لگتی ہے۔ اسے ہر بات سے منع کیا جاتا ہے۔ اگر گھر میں بھائی موجود ہوں تو ان سے ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ باتیں ابتدا ہی سے لڑکی کے ذہن پر نقش ہونے لگتی ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ اپنی بیالوجی کی وجہ سے جنسی عمل اور تولید عورت کی ساخت میں شامل ہے لیکن فرائیڈ کا بار بار مرد کے عضو تناسل کو عورت کی سوچ' احساس اور

خواہشات کا محور بنانا اور پھر مایوس ہو کر casteration کی منفیت میں مبتلا ہونا محلِ نظر ہے۔

ہم اس بات کو یہیں چھوڑ کر ایک مردانہ اور بیحد متشدد معاشرے میں عورت کی جسمانی اور ذہنی نشو ونما کی طرف بڑھتے ہیں۔ کیونکہ عورت کی ذہنی تشکیل اور اس کے جنسی رویہ sexuality ایڈپس یا الیکٹرا کمپلیکس اتنی بنیادی حیثیت نہیں رکھتے جتنی اہمیت فرائید نے انہیں دی ہے۔ بھائی اور باپ سے اس کا رشتہ دوہرا ambivalent ہوتا ہے۔ تاہم گھر کے ایک فرد ہونے کے ناطے وہ ان تمام تعصبات' پسند یا ناپسند' مزاج اور خانگی کلچرل کو وراثت میں لیتی ہے یا اسے قبول کرتی ہے۔ اسے یہ بھی پتہ ہے کہ اگر وہ سید خاندان سے ہے تو اس کا بیاہ سیدوں میں ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ کشمیری ہے تو اسے کشمیری شوہر سے ہی شادی کرنا ہے۔ اس قسم کی حد بندیاں قبائلی نوعیت کی ہیں۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں لڑکی نفسیاتی ساخت کو متاثر کرنے لگتی ہیں۔ لڑکی کا عورت کی طرف سفر بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کی بیالوجی بدلنے لگتی ہے' اس کے سینے کا مدور گولائیوں میں ڈھلنا' اس کا ماہوار اجرا خون کا دور اس نوع کی دوسری تبدیلیاں اس کے عورت ہونے کا اعلان ہوتی ہیں۔ وہ نامعلوم کے خوف کے باوجود مرد کی قربت چاہتی ہے۔ یہ ساری باتیں بڑے بڑے ماہرین نفسیات اور انسانی بدن سے متعلقہ علوم بدیہی طور پر بیان کر چکے ہیں۔ لڑکی کو اپنی جنسی نشو و نما کے حوالے سے ماں باپ کے گھر میں کسی قسم کی آزادی نہیں ہوتی۔ پاکستانی معاشرے میں لڑکیوں کی نفسیاتی ساخت میں کجی پیدا کرنے کی ایک وجہ ان کی ماؤں کا Obsessive attitude ہے۔ وہ دیوانگی کی حد تک لڑکیوں کا تعاقب کرتی ہیں۔ شادی کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے پاکستانی لڑکی بہت سی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوتی ہے جو اس کی معاشرتی زندگی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔

ہمارے معاشرے میں شادی کو عورت کی معراج تصور کیا جاتا ہے' یہ اس کی

Ultimate destiny ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت ایک بہتر مستقبل کی تیاری ہوتی ہے۔ لڑکی کی فوری شادی کے پس منظر میں چند ایک محرکات ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ متوسط اور نچلے متوسط طبقوں میں لڑکی کو ایک اقتصادی بوجھ تصور کیا جاتا ہے ' دوسری وجہ اخلاقی ہوتی ہے کہ وہ جنسی جبلت کے وفور میں کہیں لڑکوں سے جنسی تعلقات قائم کر کے گمراہی کے راستے پر نہ چل سکے۔ گمراہی کا راستہ اصول لذت سکھاتا ہے۔ جوان لڑکی ہر طبقے کے مردوں کے لئے ایکTemptation ہوتی ہے' چنانچہ والدین اسے اپنے گھر سے دوسرے گھر تک لڑکی کو حفاظت سے پہنچانا چاہتے ہیں۔ لڑکی سب سے بڑی دشمن اس کی Sexuality ہوتی ہے۔ اس پر معاشرے یا والدین کی طرف سے شدید پہرہ اسے ہم جنس پرستی اور خود لذتیت کی طرف لے جاتا ہے۔ جو ایک احتجاج ہے فرد کی جبلتوں اور معاشرے کی اخلاقی قدروں کا جنہیں سالم رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مسلم معاشروں میں لڑکی کی حفاظت کی ایک بڑی وجہ اس کے کنوارپن کا تصور بھی ہے جو بڑاhaunting ہوتا ہے۔ مسلم ممالک میں اور خصوصا عرب ممالک میں آج بھی شادی کے موقع پر عورت کے کنوار پن کو توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ الجزائر میں کسی غیر شادی شدہ لڑکی یا عورت سے جنسی تعلق رکھنا کم و بیش ناممکن ہے۔ اگر کوئی غیر شادی شدہ کامیساریہ میں یہ رپورٹ درج کرا دے کہ فلاں شخص نے اس سے جنسی روابط قائم کئے ہیں تو مشینری حرکت میں آ جاتی ہے ' ثبوت ملنے کے بعد اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ لڑکی سے شادی کرے ' انکار کی صورت میں اسے پانچ سال سزا دی جاتی ہے۔ تاہم مطلقہ عورتیں کھلے بندوں کال گرلز کے طور پر کام کرتی ہیں۔ مراکو کی نسائیت کی علمبردار فاطمہ مرنیسی لکھتی ہے کہ مراکو میں عورتوں کے لئے قوانین بہت شدید ہیں اور انہیں کسی قسم کی آزادی نہیں ہے' ۔ پاکستان میں ' اس کے برعکس ' عورتوں کے لئے کوئی خصوصی قوانین نہیں ہیں جو ان کی آزادی میں حائل ہوتے ہوں تاہم اس کے باوجود پاکستانی معاشرے کے کلچر اور اس کی فرسودہ رسوم نے

عورت اور اس کے خاندان کو ایک حد تک بے بس کر دیا ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی کے کنوار پن کی حفاظت اس لئے بھی کی جاتی ہے کہ اس کی مستقبل کی کامیاب شادی شدہ زندگی کا انحصار اس پر ہے۔ عورت سو چلتر کرے مرد بھانپ جاتا ہے کہ اس کی بیوی یا عورت جنسی عمل میں سے گزری ہے۔ یہ عورت کے لئے خطرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ والدین کی کڑی نگرانی' معاشرتی رسوم کی بالا دستی' احساس گناہ کا بالواسطہ یا براہ راست اثر شادی سے پہلے لڑکیوں یا عورتوں کو جنسی عمل سے باز رکھتا ہے۔ معاشرہ اور والدین لڑکیوں کو جنس اور مرد سے اتنا خائف کر دیتے ہیں کہ وہ شادی کے بعد بھی جنسی عمل کو بعمل مجبوری تیار ہوتی ہیں۔ جنسی عمل کے دوران پاکستانی عورتوں کا رویہ ایک مفعول جانور جیسا ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی جنسی جبلت اور behaviour کے اظہار کا حوصلہ نہیں رکھتیں۔ جنسی عمل یک طرفہ ٹریفک نہیں ہوتی۔ یہاں کی پیشہ ور عورتیں بھی جنسی عمل کی نزاکتوں سے نا آشنا ہیں۔۔ تعلیم اور معاشرتی اداروں کے فقدان' تمدنی گھٹن اور ممنوعات کی طویل فہرست کی وجہ سے وہ جنسی عمل کی ماورائیت سے آشنا نہیں ہیں۔ یہاں سب کچھ حیوانی اور crude ہے جس میں جمالیات اور good manners مفقود ہیں کیونکہ وہ اصول لذت سے نا آشنا ہیں جسے فرائیڈ انسانی تہذیب کی بنیاد کہتا ہے۔ یہاں شادی شدہ عورتیں اولاد پیدا کرنے کے لئے جنسی عمل سے گزرتی ہیں۔ ' جنسی عمل لذت' اطمینان اور شخصیت کے ابال کو ختم کرنے کی بجائے ایک کراہت پیدا کرتا ہے۔ پاکستانی عورت ' اس کا تعلق کسی بھی طبقے سے کیوں نہ ہو ' ناتراشیدہ ہے۔ بات صرف فیشن ایبل کپڑوں اور دلذیب میک اَپ سے نہیں بنتی۔ ان کی ایکسٹروورشن بھی بناوٹی ہوتی ہے یا وہ کوئی مفاد حاصل کرنے کا روپ ہوتا ہے۔

یہاں یہ کہنا مقصود نہیں کہ repression یا کلچرل دباؤ کی وجہ سے پاکستانی لڑکیاں یا عورتیں جنس سے بہت دور ہیں بلکہ اس امر کی نشاندہی کرنی ہے کہ مذہب سے زیادہ کلچرل دباؤ (بدنامی کا خوف' ناجائز اولاد کا خوف) کے باوجود موقعہ ملنے پر پاکستانی غیر

شادی شدہ اور شادی شدہ لڑکیاں اور خواتین چوری چھپے وہی کچھ کرتی ہیں جو جنسی جبلت کے شدید دباؤ کے تحت ہر انسان کرتا ہے۔ انسان کے اندر موجود حیوان کو قابو میں رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جب اس حیوان کو راستہ نہیں ملتا تو وہ اندر اور باہر سے توڑ پھوڑ شروع کر دیتا ہے۔ ہمارے معاشرتی اور انفرادی رویوں میں کجی کی ایک بہت بڑی وجہ فرد کی نا مطمئن جنسی خواہش ہے اور ہمیں اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے یہاں جنسی تعلیم ایک بے حیائی تصور کی جاتی ہے۔ بہت کم پاکستانی عورتیں ذہنی طور پر خوشحال ہیں کیونکہ عام طور پر وہ زندگی میں ہر بات پر بڑ بڑاتی رہتی ہیں دوسری طرف ہر مرد ہر عورت کو ریپ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ان دونوں فریقین میں یہ بُعد اور تنہائی کا احساس معاشرتی قید و بند کی وجہ سے ہے۔ (پاکستان میں مرد کی جنسی زندگی شادی کے ساتھ یعنی اٹھائیس انتیس سال سے شروع ہوتی ہے یعنی اس وقت جب جنسی جذبے کی وحشت مدہم پڑنے لگتی ہے اور پچاس برس تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیتی ہے' اس عمر کے بعد صرف ہوس رہ جاتی ہے۔ اس کی شادی شدہ زندگی بھی ایک بے کیف ضیافت ہوتی ہے جس کی وجہ پاکستانی عورتوں کا پھوہڑ پن ہے۔

عام مشاہدہ ہے کہ پاکستانی عورتوں کے لئے مذہب بہت بڑا سہارا ہے۔۔ وہ ہر معاملے میں مذہب کا سہارا لیتی ہیں' ان کی مذہب سے idealization نفسیاتی بھی ہوتی ہے۔ لیکن جب مذہب سے ان کی توقعات پوری نہیں ہوتیں تو وہ پیروں فقیروں اور نجومیوں کے چکر میں پڑ جاتی ہیں۔ وہ مذہبی رسوم اور مذہبی تہواروں کی پابندی کرتی ہیں۔ بات بات پر مذہب سے اسناد کو لاتی ہیں ' عبادات کی تلقین کرتی ہیں' کھاتے پیتے گھرانوں میں کوئی کام نہ ہوا تو میلاد کراتی ہیں۔ عورتیں جو مرادیں مانگتی ہیں ان میں بیٹیوں کے رشتے اور خاوندوں کو راہ راست پر لانا ان کے ایجنڈے کی اہم شقیں ہوتی ہیں۔ بیٹیوں کے رشتے تو شاید مل جاتے ہوں لیکن خاوند راہ راست پر نہیں آتے 'پیری' فقری' دم درود' تعویز' منتیں مانگنا وغیرہ ایسے مشاغل

متوسط یا اونچے گھرانوں میں عام ہوتے ہیں۔ وہ جس سائیکی کے مظہر ہیں وہ اتنی عیاں ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مذہب تو نہیں ritual کے ذریعے ان مرادوں کو پانا ہے جو خالصتاً ارضی ہیں۔ یہ دین دار عورتیں مذہب کی غائبی طاقت کو صرف اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہیں لیکن جب مذہب کے حوالے سے عورتوں کے حقوق یا ان کے مجوزہ طریق زندگی کا ذکر آتا ہے تو وہ زیر لب بڑبڑاتی ہیں۔ نسائیت کی علمبردار عورتیں کہتی ہیں کہ مذاہب بھی تو مردوں نے بنائے ہیں۔ یہ دلیل نہیں غصے کا اظہار ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مرد کے کثیر الازدواج ہونے کی اجازت اور عورت کو مرد کا نصف حصہ دینا عورت کے حقوق کے خلاف ہے۔ دو عورتوں کی ایک مرد کے برابر شہادت بھی عورت کو مرد سے کمتر بناتا ہے' ان میں مساواتی رشتہ نہیں ہے اور عورت کو حقیر ثابت کیا گیا ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے۔ یہ اعتراضات کرنے والی مہم جو خواتین بھول جاتی ہیں زمانہ جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا تھا اس کے مقابلے میں اسلام نے عورت کے حقوق تسلیم کر کے انہیں ایک ریلیف دیا۔ وگرنہ تو اس زمانے میں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زمین میں دفن کردیا جاتا تھا۔

عورت نے مرد کی پسلی سے جنم لیا یا کسی اور طریقے سے معرض وجود میں آئی ہو یہ سوال فی زمانہ کسی معنویت کا حامل نہیں ہے' اور یہ بات بھی اتنی اہم نہیں ہے کہ عورت کا انفرادی وجود نہیں ہے اس کا حوالہ زیست مرد ہے' وہ WO-MAN یا Fe--Male ہے' وہ نامکمل مرد ہے۔۔ عورت کی بدنی ساخت اس کی ذہنی ساخت پر غالب ہے۔ جس کا میدان عمل اور کارکردگی مرد کی نسبت مختلف ہے اور اس کے نفسیاتی رجحانات' خواہشیں اور امنگیں غایت درجہ اختلاف رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر شادی کا مسئلہ عورت کی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس کا بدن نسل انسانی کی تولید کے لئے بنا ہے۔ جو عورتیں شادی یا جنسی عمل سے دور رہتی ہیں وہ اپنے وجود کی حیثیت سے انکار کر کے مرد کی طرح زندہ

رہتی ہیں۔ شادی کے حوالے سے عورت کے بعض بنیادی حقوق کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے
جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔ اسلام نے عورت کے جو حقوق متعین کئے ہیں ان پر ہر
طرف سے کافی بے ثمر بحثیں ہو چکی ہیں۔ ایوب خاں کے زمانے میں عورتوں کے
حقوق کا جب بہت دباؤ تھا تو حکومت وقت نے مسلم فیملی لاز میں کچھ ترامیم کیں جن
میں سب سے اہم ازدواج پر حد بندی تھی کہ مرد ایک وقت میں ایک ہی بیوی کے
ساتھ رہ سکتا ہے' پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی کی
اجازت ضروری ہے۔ علما اور عوام کی طرف سے اس قانونی ترمیم پر بہت لے دے
ہوئی' عورتیں بہت خوش ہوئیں کہ انہیں مردوں کی بالا دستی سے محفوظ رہنے کی
قانونی سند مل گئی ہے۔ مردوں کے احتجاج پر عورتوں نے انہیں بہت لعن طعن کی کہ
مرد بدمعاش ہوتا ہے ہمیشہ دوسری عورت کے چکر میں رہتا ہے۔ عورتوں کی یہ
خوشی عارضی تھی' مردوں نے ناخوش عورتوں کے تعاون سے extra
marital relations کی راہ نکال لی۔ اسلام اس اعتبار سے دنیا کا پہلا اور آخری
مذہب ہے جس نے مرد کی لا محدود اور منہ زور لیبڈو کو شناخت کر کے اسے ایک
تخریبی قوت بننے سے روکنے کے لئے ایک سے زیادہ ازدواج اور لونڈیوں کی
اجازت دی ہے - یہ مرد کی جنسی انارکی کو روکنے کا ایک ذریعہ ہے۔ پڑھی لکھی
خواتین دبے لفظوں میں کہتی ہیں کہ عورتوں کو بھی ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کا حق
ہونا چاہئے۔ ہیومن رائٹس والوں کے لئے یہ دلیل تو وزنی ہے لیکن انسانی سرشت
کی تاریخ اس کو قبول نہیں کرتی۔ نیا زمانہ ہو یا پرانا مذہب اور معاشرے نے عورت
کو یہ اجازت نہیں دی۔ اس لئے نہیں کہ شروع ہی سے یہ دنیا مردوں کا معاشرہ
رہی ہے بلکہ اس کے مضمرات انسانی سرشت کو ابتر کرنے کا سامان ہیں۔ سٹریٹبرگ
کے ڈرامہ "فادر" کے آخر میں عورت اپنے خاوند سے کہتی ہے کہ ان کے بچے کی
صحیح ولدیت کے بارے میں صرف وہی جان سکتی ہے۔ اس تصویر کا دوسرا رخ ایک
آئرش عورت کا بیان ہے جو راقم کو آئرلینڈ کے ایک شہر کیون میں ملی اس نے باتوں

باتوں میں اپنی بچی کے بارے میں بتایا" میں بھول گئی ہوں کہ اس کی لڑکی کا باپ گریک تھا یا کوئی یورپین"۔ مرد اپنی اولاد کی ولدیت کے بارے میں یقینی ہونا چاہتا ہے کیونکہ اس میں وراثت کا مسئلہ پیش پیش ہوتا ہے۔ میٹریارکل زمانے میں ولدیت عورت کی طرف سے چلتی تھی۔ سعودی عرب میں زمانہ جاہلیت میں شادی کی مختلف قسمیں تھیں جن میں متعہ بھی شامل تھا۔ وہاں اولاد پیدا کرنے کے لئے عارضی شادی بھی کی جاتی تھی ۔ عورت مرد کے ساتھ رہتی جب وہ امید سے ہوتی تو مرد چلا جاتا۔ اس رشتہ سے پیدا ہونے والی اولاد کی ولدیت ماں کی طرف سے قائم ہوتی تھی۔

معاشرے میں شادی کے ذریعے بہت سی خرابیوں کو روکنا مقصود ہے۔ یہ زندگی کو ایک نارمل طریقے سے بسر کرنے کا وسیلہ ہے۔اس کے ساتھ ایک بہتر زندگی کی توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ یہ ایک معاہدہ ہے جو عورت اور مرد کے والدین یا لواحقین فریقین کی جانب سے کرتے ہیں۔

معاشرتی اور خانگی ناخوشی کی چند ایک وجوہات ہیں۔۔۱۔ اقتصادی ناہمواری ۲۔ بیوی سے علاوہ کسی اور عورت کی خواہش۔ ۳۔ آدرشوں میں اختلاف ۴۔ ذہنی عدم مطابقت ۔

آپ یہاں یہ موقف اختیار کر سکتے ہیں کہ خوشحال طبقوں میں جہاں مالی تنگی نہیں ہے اور ہر طرح کی فراوانی ہے وہاں ناخوشی ' رنج اور علیحدگی کی بنیاد اقتصادی نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ چاہنے کی خواہش کبھی ختم نہیں ہوتی اور اقتصادی برتری کی خاموش جنگ' ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنے اور ایک سے زیادہ عورتوں سے تعلق کی خواہش تمام انسانوں میں جاری رہتی ہے۔شادی جسے عورت اور آدمی کے لئے نیا دروازہ کہا جاتا ہے کسی طور پر امتحان سے کم نہیں ہوتا ہے۔ زندگی میں بہت کم شادیاں کامیاب ہوتی ہیں 'بہت سے لوگ صبر شکر سے کام لیتے ہیں۔ ان میں کامیابی اسی وقت ہے جب شوہر بیوی کا چپراسی بن کر رہے' اس کی ہاں ہاں میں ملاتا رہے' ہر وقت اس کی خوشی کے لئے کچھ نہ کچھ کرتا رہے۔ مرد عیار اور

مکر کرنے کا ماہر ہوتا ہے۔۔ پاکستانی عورت' اس کا تعلق خواہ کسی طبقے سے ہو' ہمیشہ مظلوم ہونے کا تاثر دیتی ہے' یہ ایک گھٹے ہوئے کلچر کا نتیجہ ہے۔ متوسط اور نچلے طبقوں میں زیادہ آہ وبکا مالی تنگی کی ہوتی ہے جو عورت کو چڑ چڑا اور منہ زور بنا دیتی ہے۔ خانگی ناراضگی دوسری وجہ عورت کے خمیر میں شک کا عنصر ہوتا ہے۔ اس کی غیر مطمئن لیبڈو اس کے اندر یہ delusion پیدا کرتی ہے کہ خاوند کا ایک تواتر سے اس کی طرف رجوع نہ کرنے کا مطلب کسی اور عورت سے تعلق ہے۔ عورت کا یہ ہسٹریکل رویہ تیس برس کی عمر کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ رویہ مرد کو مشتعل کرنے اور انتہائی اقدام لینے پر مجبور کرتا ہے۔ جس کا انجام خلع اور طلاق کے بیشمار مقدمات ہیں جو عدالتوں میں زیر سماعت ہیں۔ در اصل مرد اور عورت متحارب فریق ہیں جن کا ایک ہونا ممکن نہیں ۔ایک عورت ایک مختلف پس منظر سے خاوند کے گھر آتی ہے اس کا رہنا سہنا کھانا پینا اور معاشرتی عادات بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی رفاقت سے ایک دوسرے کو سمجھا جا سکتا ہے ایک دوسرے کے باطن میں اترا نہیں جا سکتا۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لئے" دوسرا" ہوتے ہیں' اس لئے اجنبیت کا قائم رہنا لازمی ہوتا ہے۔

پاکستانی میں ابھی تک eternal woman کا تصور جاری و ساری ہے۔ یہی ازلی عورت جو بیوی کے روپ میں نمودار ہوتی ہے تو اس کی آمد سے بہت پہلے ہی توقعات اس کی منتظر ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں اردو میں عورتوں کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد نے اس موضوع پر توجہ دی لیکن انہوں نے ایک بیوی کا جو تصور پیش کیا وہ ایک نوکرانی کا تھا۔ بعد میں راشد الخیری نے بھی عورتوں پر مردوں کے مظالم کی کہانیاں لکھیں= بھارت کی مصنفہ عصمت چغتائی نےعورت کی جنسیات پر کمزور سا قلم اٹھایا اور ایک جنسی پرورش کے علاوہ وہ اس سے آگے نہ جا سکیں۔گزشتہ دس پندرہ برسوں سے چند ایک پاکستانی خواتین نے انگریزی زبان میں عورت کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ چونکہ ان میں سے

کوئی بھی پیشہ ور ادیب نہیں ہے اس لئے وہ اس موضوع کی کنہ تک نہیں پہنچ سکیں۔ اصل موضوع وڈیروں کے گھروں میں پابند مجبور بیویوں پر وڈیروں کے مظالم سے بات بہت آگے ہے۔۔ اس میں ہماری پوری سوشیالوجی ملوث ہے۔ جو لڑکی بیاہی جاتی ہے اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ سارا گھر سنبھالے گی' اپنے سسر اور ساس کی خدمت کرے گی' شوہر کے بہن بھائیوں کی ہاں میں ہاں ملائے گی' سسر اور ساس کے کپڑے استری کرے گی' گھر کے ملازموں سے چیخ چیخ کر کام کروائے گی' کم سے کم میک اپ کرے گی۔ اور اپنے میکے کو شوہر کے گھر آنے سے روکے گی۔ ہر کام کرنے سے پہلے اجازت مانگے گی۔ خاوند سے دور رہے گی۔ کم سے کم ڈش دیکھے گی۔ سات سے نو مہینوں کے درمیان اسے لڑکا بھی پیدا کرنا ہے۔ اگر لڑکی پیدا ہو گئی تو توے توے ہوگی۔ یہ پاکستانی بیوی کا روایتی رول تصور کیا جاتا ہے۔ ایک گرہستی کے لئے اسے سب کچھ قبول کرنا ہے اور اس سے انحراف اس کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے حال اور مستقبل کا انحصار اس کے خاوند کی مالی حیثیت پر ہے۔

کہتے ہیں کہ عورت کے سو چلتر ہوتے ہیں' اس میں مرد کی نسبت برداشت کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے' جب برداشت کی حد ختم ہو جائے تو پھر وہ بغاوت کرتی ہے لیکن یہ سب کچھ خاموشی سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ جنسی طور پر خاوند کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتی ہے' اسے یہ بھی معلوم ہے کہ پاکستانی معاشرے میں دوسری عورت تک رسائی حاصل کرنا کافی مشکل ہوتا ہے کیونکہ یہ غیبت' طعنوں اور منافقت کا معاشرہ ہے جہاں ہر کوئی اپنے آپ کو صداقت پر دوسرے کو گمراہ تصور کرتا ہے۔ ہر عورت مرد کی جانب سے خوشامد اور توجہ چاہتی ہے' وہ جانتی ہے کہ وہ جنس کے ذریعے خاوند کے ذہن تک پہنچ سکتی ہے' اسے فیصلوں پر مجبور کر سکتی ہے کیونکہ مرد کی لبیڈو اس کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے۔ جنس کے ذریعے مرد کی مغلوبیت سب سے بڑی مثال کلوپیٹرا اور سیزر اور مارک اینٹونی کی کہانی ہے۔

عورت بطور بیوی علیحدگی اور مرد پر پورا تصرف چاہتی ہے جو پاکستان میں جائنٹ فیملی سسٹم میں ممکن نہیں ہے۔ عورت دیہات کی ہو یا شہر کی اپنا الگ گھر چاہتی ہے۔ پاکستانی معاشرے میں جائنٹ فیملی سسٹم کا شکستہ ہونا یہاں کی عورت کی مروجہ کلچر اور معاشرت کے خلاف ایک خاموش بغاوت ہے۔ اس بارے میں بہت احتجاج بھی ہوئے ہیں کہ یہ مغرب کے کلچر کا اثر ہے' یہ جدید تعلیم کا منفی اثر ہے۔ آپ جو کچھ مرضی کہیں یہ امر واقعہ ہے۔

عورت اتنی سیدھی اور معصوم نہیں ہوتی جتنا اسے سمجھا جاتا ہے۔ اس کا زندگی کا پلان مرد کی نسبت مختلف ہوتا ہے۔ یہ سارا کام جبلی سطح پر ہوتا ہے اس میں تعلیم اور جہالت کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ شادی عورت کے لئے ایک رسک ہوتی ہے' یہ ایک " نامعلوم " unknown کی دنیا ہے۔ اگر عورت مرد کو بستر پر جیت کر لیتی ہے تو اس کی دوسری مہمات آسان ہوجاتی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ پاکستانی عورت کلچرل' معلوماتی' تعلیمی اور تجربے کی سطح پر اتنی نابلد ہے کہ وہ شوہر کو نہیں جیت سکتی۔ وہ مرد کے اکھڑپن اگریشن کو اس کی ناراضگی سمجھتی ہے اور فرض محال مرد اس کے دام میں آجاتا ہے تو وہ اپنی جنسی خواہش کی تسکین کے لئے اس پر فریفتگی کا مکر کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جنسی سطح پر بھی مرد کی بالا دستی ہے۔ صبح ہو یا شام' بیوی بیمار ہو یا صحت مند' وہ جذباتی طور پر آمادہ ہو نہ' مرد اس کی پرواہ نہیں کرتا اور اسے ہمبستر ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ عورت کا انکار اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کرتا ہے۔ عورت اور مرد کا بنیادی تعلق جنس کا ہے۔ اگر یہ محض انسانی تعلق ہے تو پھر مرد اس کو بیاہ کر گھر کیوں لائے گا' اس کے اخراجات کیوں برداشت کرے گا۔ اسے اپنی بقاء کے لئے اولاد بھی پیدا کرنا ہے، اس لئے عورت اس کی دنیوی ضرورت ہے جس میں کم سے کم جذباتی وابستگی ہوتی ہیے۔ شادی کے ادارے کو marriage of convenience کہتے ہیں۔ عورت کو اس سے معاشرے کی بہت سی منفی قوتوں سے تحفظ مل جاتا ہے۔ وہ ایک

حد تک کمانے کے صعب سے آزاد ہو جاتی ہے لیکن اسے اپنی پسند کے خلاف بھی ایک بد تمیز مرد کو قبول کرنے کی مجبوری ہے۔ شادی ایک سمجھوتا ہے اور سمجھوتا ایک اچھا لفظ نہیں ہے کیونکہ اس میں خلوص کی بجائے مصلحت ہوتی ہے' جو انسانی رشتوں کی purity کو منہدم کرتی ہے۔ اسلام کا شادی کا تصور بیحد pragmatic اور انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ اسلام میں عورت اور مرد کی جنسیت کے بارے میں جو حقائق بیان کئے ہیں' بے شمار صدیوں کے بعد ماہرین نفسیات اور خاص طور پر فرائیڈ نے ان کی توثیق کی ہے۔ والدین کے حوالے سے عورت کو وہی رتبہ دیا گیا ہے جو مرد کا ہے۔ شادی کے انسٹی ٹیوشن میں وہ نیم مذہبی عنصر نہیں ہے۔ یہ عورت اور آدمی کے درمیان ایک سول کنٹریکٹ ہے۔ اگر یہ احسن طریقے سے چلتا ہے تو ٹھیک ہے وگرنہ ہر دو فریقین کو علیحدگی کے برابر حقوق ہیں۔ ہندوؤں میں میاں بیوی کا رشتہ نیم مذہبی نوعیت کا ہوا کرتا تھا' شوہر کا درجہ ایک اوتار کا تھا اور بیوی ساری عمر اس اوتار کی خدمت کرتی تھی۔ شوہر کی موت کے بعد اس کی بیوی کا ستی ہونا ایک مذہبی فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ ایک نہایت بھیمانہ رسم تھی جس میں عورت کو زندہ سوزی پر مجبور کیا جاتا تھا۔ امتداد زمانہ سے یہ رسم ختم ہو چکی ہیں اور اب ہندو عورتیں بھی ہنسی خوشی طلاق لیتی یا دیتی ہیں۔

طلاق عورت کے لئے بہت بڑا حادثہ ہوتا ہے۔ اس کی شادی خواہ والدین نے کی ہو یا اس نے خود' اس کی ذات کے کسی نہ کسی گوشے میں مرد سے بدگمانی کا احساس موجود رہتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا خطرہ خود اس کی ہم جنس عورت ہوتی ہے جس سے اس نے اپنے شوہر کو بچانا ہے۔ عورت عورت کے لئے خطرہ ہوتی ہے۔ شادی کے فورا بعد عورت کا دفاعی نظام حرکت میں آجاتا ہے۔ کچھ مہینوں تک تو اس کے بدن کا سحر خاوند پر قائم رہتا ہے' جب مرد کا جنسی ابال بیٹھنے لگتا ہے تو صورتحال بدل جاتی ہے۔ یکسانگی اور مانوسیت جنسی کشش کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے۔ چند ایک سالوں میں میاں بیوی کا جنسی تعلق ایک روٹین بن جاتا ہے۔

عورت اس صورتحال سے بچنے کے لئے اولاد پیدا کرتی ہے کہ اس کے شوہر کی دلچسپی عورت کے حوالے سے قائم رہے۔ اولاد پیدا کرنا womanhood کی تکمیل ہے۔ عورت کو اس میں اپنا تحفظ نظر آتا ہے۔ اگر فرائیڈ کی بات مان لی جائے تو پھر عورت کا اولاد سے تعلق غیر مرئی incest پر مبنی ہوتا ہے۔ ساس ہمیشہ اپنی بہو کا تعاقب کرتی ہے اور اسے کا قافیہ تنگ کر کے سادیتی لذت لیتی ہے۔ شادی شدہ عورت اپنی ساس سے نجات چاہتی ہے کہ وہ خاوند کے ساتھ کسی مداخلت کے بغیر تعلق چاہتی ہے کیونکہ عورت کو ملکیت کا خبط ہوتا ہے۔ اسے خاوند پر بیحد اعتماد ہوتا ہے اس لئے کہ وہ پہلا مرد ہے جس نے انگریزی کی اصطلاح میں اسے deflower کیا ہوتا ہے۔ جنسی عمل مرد کی نسبت عورت کے لئے ایک بہت بڑا واقعہ یا حادثہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے عورت کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے' معاشرتی سطح پر اس کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے۔ جب تک وہ غیر شادی شدہ ہوتی ہے اس کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ شادی کے ساتھ ہی وہ ایک مرد کے تصرف میں چلی جاتی ہے۔ شادی شدہ زندگی کا آغاز بھی بیحد بہیمانہ ہوتا ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت جو ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہیں یا سرسری طور پر ایک دوسرے کو جانتے ہیں وہ آمنے سامنے ہوتے ہی ایک دوسرے کے ازار بند کھولنے لگتے ہیں' معاشرتی اور مذہبی سطحوں پر اس عمل کو قبول کیا جاتا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعتراف بھی ہے کہ عورت اور آدمی کا تعلق حیاتیاتی ہے ذہنی نہیں ہے۔ جس طرح مادہ اور نر جانور ایک دوسرے کو دیکھتے ہی جنس کی طرف رجوع کرتے ہیں'۔ انسان جسے متمدن حیوان کہا جاتا ہے' اس کا رویہ بھی غیر متمدن حیوان ایسا ہوتا ہے - یہ رسم دنیا ہے جس پر کوئی معترض نہیں ہوتا۔ عورت عام حالات میں ایک ہی مرد سے منسلک رہنا چاہتی ہے کیونکہ شادی کے بعد اس کا بدنی نظام بدلنے لگتا ہے اور شوہر بتدریج اس سے پیچھے ہٹنے لگتا ہے۔ عورت کا سب بڑا دشمن وقت ہے۔ عورت کے شباب کی مہلت مختصر ہوتی ہے جو ماہرین نفسیات اور تجربہ کار دانشمندوں کی رائے

میں ۳۵ برس تک ہوتی ہے جس کے بعد عورت کا جسمانی انہدام شروع ہو جاتا ہے۔ عورت بدن کے ذریعے زندہ رہتی ہے۔ جب یہ دیواریں ہلنے لگتی ہیں کہ اب وہ infertility کی طرف جا رہی ہے تو اس کی شخصیت میں تبدیلی آنے لگتی ہے۔۔ پاکستانی عورتیں اس عمر میں جھگڑالو' ضدی اور بدتمیز ہو جاتی ہیں' ان کا خاوندوں کے ساتھ رویہ جارہانہ ہوتا ہے۔ وہ ہربات کو جھگڑا بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے اندر چھپی ہوئی مردانگی باہر نکلتی ہے۔ حالانکہ اس عمر میں انہیں اپنے آپ کو بہتر طریقے سے carry کرنا چاہیئے۔ اس کے برعکس پاکستانی عورت اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیتی ہے۔ موٹاپا' ذاتی ہائیجین کی کمی' چیخ چیخ کر بولنا اس کے چند ایک مظاہر ہیں۔ چنانچہ یہی وہ عمر ہے جہاں سے طلاقوں کا عمل شروع ہوتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ بنیادی طور پر ایک جھگڑالو اور عدم برداشت کا معاشرہ ہے جہاں ہر بات کو نفع و نقصان کے حوالے سے اس کے فوری سیاق و سباق میں دیکھا جاتا ہے۔ مردوں کی دنیا میں رہتے ہوئے عورت کے لئے مرد کی بالا دستی سے بچنا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ مرد ہمیشہ ظلم اور زیادتی پر تلا ہوتا ہے نسائیت کی علمبردار عورتوں کی طرف سے ایک شور و شغب ہے۔ خانگی سطح پر ظالم کون ہے اس کا انحصار اس صورتحال پر ہے جس میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ پاکستان کے متوسط اور نچلے طبقے میں خانگی اختلاف کی سب سے بڑی وجہ اقتصادی ہے۔ پاکستانی خاندان کا سائز بالعموم دس سے پندرہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے جس کی کفالت ایک ہی آدمی کو کرنی ہوتی ہے کیونکہ یہاں نوکریوں کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورتحال میں مرد کولہو کا بیل بن جاتا ہے۔ جدید زندگی بہت زیادہ مطالبے کرتی ہے' ہم ہر طرح کی مالی تنگی کے باوجود زندگی کی تمام سہولتیں بھی چاہتے ہیں جو ہمارے وسائل سے باہر ہوتی ہیں۔ خواب دیکھنا یا خواہش کے ہاتھوں بے قابو ہونا عورت کی فطرت میں ہے۔ وہ والدین کے گھر کی غلامی سے شادی کو رہائی سمجھتی ہے

لیکن اسے جلد ہی احساس ہو جاتا ہے کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ غلام ہے۔۔ چنانچہ وہ اپنے بدن کا سہارا لیتی ہے اور اپنی وہ تمام خواہشیں پورا کرنا چاہتی ہے جن کا اس نے خواب دیکھا ہوتا ہے۔ اگر خاوند متوسط یا نیچے کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں اور بتدریج خاوند کی کمزور معیشت ان کی ناراضگی کا سبب بن جاتی ہے۔ آپ نے بھی یہ مشاہدہ کیا ہوگا کہ جب بھی عورتیں اکٹھی بیٹھتی ہیں تو خاوندوں کی برائیاں کرنا ان کا مرغوب مشغلہ ہوتا ہے۔ پاکستانی عورتیں ہمیشہ مردوں سے ناراض رہتی ہیں۔ پبلک پلیسز میں مرد کو دیکھتے ہی خشمگیں ہو جاتی ہیں' ان کے چہرے نفرت سے تن جاتے ہیں اور ان کی گفتگو کا انداز نا تراشیدہ ہوتا ہے۔ اگر چہ پاکستانی عورتوں نے مغرب کی دیکھا دیکھی بہت کچھ اپنایا ہے لیکن ان میں کلچر کی شدید کمی ہے۔

پاکستانی عورت کو مظلوم کہا جاتا ہے ۔ آئے دن اخباروں میں عورتوں پر تشدد ی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی کہانیاں ہیں جو منظر عام پر نہیں آتیں ۔ یہ ضروری نہیں کہ ناک کاٹنا' منہ پر تیزاب پھینکنا سر مونڈ دینا' آدھی رات کو گھر سے باہر نکال دینا' اس کے اخراجات اٹھانے سے انکار اور اجتماعی ریپ ہی تشدد کے واقعات ہیں' ان سے زیادہ اہم جذباتی اور نفسیاتی تشدد ہے جس سے عمر بھر پاکستانی عورتیں دو چار رہتی ہیں۔اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستانی عورت دماغی طور پر قدرے retarded ہے تو بیشتر پاکستانی مرد' خواہ وہ تعلیم اور مرتبے کی کسی سیڑھی پر ہوں بنیادی طور پر اجڈ اور غیر متمدن ہیں اور اس کی مثالیں نہ صرف گھروں میں سرکاری دفتروں بلکہ سارے معاشرے میں ملتی ہیں۔ جو معاشرہ ایک طویل مدت سے غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہا ہو اس کے انفرادی اور اجتماعی رویے بھی نارمیلی کے سارے معیاروں کو متزلزل کر دیتے ہیں۔ عام پاکستانی آدمی کا عورت کے بارے میں رویہ ایک درندے کا ہے کہ عورت ایک شکار ہے جسے موقعہ ملتے ہی چیر پھاڑ دینا چاہیئے۔ شاید وہ اسی باعث عورت کو انسان کا درجہ نہیں

دے سکتا اس کی لیبڈو اس کے دماغ کو چڑھی ہوئی ہے اور اس کے عمومی رویے میں تخریب کا عنصر غالب ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ پاکستانی معاشرے میں جنس ایک ا۔سنگزائٹی بنی ہوئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ایک قدامت پسند معاشرے کی بندشیں ہیں جو چوری چھپے ہر بات کی اجازت دیتا ہے لیکن جب بات ظاہر ہوتی ہے تو تمام اخلاقی اور مذہبی ضابطوں کو حرکت میں لے آتا ہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ عورت بدنی اور ذہنی طور پر مرد کی نسبت کمزور ہے اور اس کی جسمانی ساخت کی وجہ سے اس کے انفرادی رویے بھی مرد سے کافی مختلف ہیں' اسی باعث اسےhumanoid کہا جاتا ہے۔ لیکن کیا جسمانی ساخت کی وجہ سے اسے بعض بنیادی انسانی حقوق سے محروم کیا جا سکتا ہے؟ یہ سوال عمرانی بھی ہے اور انسانی بھی۔ پاکستانی معاشرہ جو اس وقت کثرت آبادی کے عذاب سے گزر رہا ہے۔ اس کی نصف آبادی عورتوں پر مشتمل ہے یعنی سات کروڑ کے قریب لڑکیاں اور عورتیں گھروں کے پنجروں میں بند صرف اولاد پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ زمانہ گزر گیا جب عورت کا بیرون خانہ کام کاج کرنا برا سمجھا جاتا تھا۔ عورت صرف مصیبت کی حالت میں باہر نکلتی تھی۔ اب تو ہر عورت مصیبت میں گرفتار ہے۔اب تو والدین ایک بد حال معیشت سے پریشان خود لڑکیوں اور بیویوں کے ملازمتوں کی تلاش میں روز و شب سرگرداں ہیں۔ہم مانیں نہ مانیں اقتصادیات نے سب کچھ زیر و زبر کر دیا ہے۔ صرف لاہور شہر میں ایک لاکھ کے قریب عورتیں جسم فروشی کے ذریعے معیشت کما رہی ہیں۔ یہ بھٹکی ہوئی عورتیں ہیں پاکستانی معاشرہ اور اس کی مشتہر اخلاقی اقدار ان عورتوں کو راہ راست پر کیوں نہیں لاتیں؟ زندہ رہنے کے لئے اب اخلاقیات پس پشت جا چکی ہے۔ ہم معاشرتی اور کلچرل تغیر سے آشنا ہوتے ہوئے نا آشنائی کا بہانہ کرتے ہیں کیونکہ ان مستقل کا حل اس معاشرے کے پاس نہیں ہے۔ اب پاکستانی عورت مردوں سے مساوات کا نہیں زندہ رہنے کا حق مانگتی ہیں۔ اور وہ اپنی آزاد معیشت چاہتی ہے کہ وہ مرد کے دست نگر نہ ہو۔

ابھی تک ہمارے معاشرے میں عورت کو بطور ورکنگ وومن کے قبول نہیں کیا گیا۔ عام خیال ہے کہ جو عورت مردوں کے ساتھ کام کرتی ہے وہ زیادہ کھل جاتی ہے' وہ ضدی ہو جاتی ہے اور اپنے فیصلے خود کرنے پر اصرار کرتی ہے۔ ہم فرائیڈ کی یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ جو عورتیں گھروں سے باہر نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں ان میں masculanity کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ عورت کو جو بات روائتی نسائیت چھوڑنے پر مجبور کر رہی ہے وہ اس کی اقتصادی آزادی ہے۔ یہ درست ہے کہ عورت کی اقتصادی آزادی سے اس کا مرد پر انحصار کم ہو جاتا ہے' وہ اپنے کنبے کے لئے محنت کرتی ہے کہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ اور مرد کی سختیوں سے نجات حاصل کر سکے۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ عورت کو گرہستی بھی سنبھالنی ہے' سارا دن دفتر کا کام کاج' پھر ہانڈی روٹی' اگر چھ سات بچے ہیں تو ان کی نگہداشت پھر خاوند کے ہر طرح کے تقاضے پورے کرنے' یہ ورکنگ وومن کی روٹین ہے جو اسے ذاتی زندگی سے محروم کر کے مشین کا ایک پرزہ بنا دیتی ہے۔ پاکستان میں بھی لاتعداد جوڑے اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ صورتحال پڑھے لکھے طبقے کی ہے۔ نچلے طبقے کی عورتیں جو جسمانی مشقت کے ذریعے اپنی معیشت کماتی ہیں ان کی زندگی بھی متوسط طبقے سے مختلف نہیں ہے۔ یہ صورتحال زندہ رہنے کا موقعہ تو ضرور دیتی ہے لیکن زندگی میں ناراضگی اور تلخی کو جنم دیتی ہے۔ جب یہ صورتحال زیادہ گھمبیر ہو جائے تو مزاجوں میں تلخی آنے لگتی ہے۔ یوں بھی ورکنگ وومن جلد ہی تحکمانہ رویہ اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ پاکستان میں طلاق کی شرح بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لاہور شہر ہی میں نو دس فیملی کورٹس ان معاملات کو نپٹانے میں لگی ہوئی ہیں۔ وہاں جا کر مقدمات کی تعداد اور زن و مرد کے ہجوم سے یوں لگتا ہے کہ سارا شہر طلاق اور خلع کی کارروائیوں میں مصروف ہے۔ اسی طرح آپ میرج بیوروز میں چلے جائیں وہاں بھی مطلقہ عورتوں کے لشکر

جرار نظر آتے ہیں جو شادی کی طالب ہیں اور مایوسی کے شب و روز بسر کر رہی ہیں۔ میرج بیوروز کے ریکارڈوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خواندہ طبقے کی عورتوں نے زیادہ تر خلع لیا ہے۔ طلاق کی بجائے خلع کے تناسب میں غیر معمولی اضافہ پاکستانی عورت کا مرد کی حاکمیت کے خلاف ایک طرح کا اعلان جنگ ہے۔ لیکن اس جنگ کے جو نتائج ہیں وہ بڑے المناک ہیں جب یہی عورتیں بے یارو مددگار اولاد ساتھ لئے زندگی کو غمناک نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ پاکستانی عورت جس صورتحال سے دوچار ہے وہ تکلیف دہ ہے۔ وہ مردوں سے اپنے حقوق اور اپنی شرائط پر زندہ رہنے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ یہ ایک تضاد ہے جو شروع ہی سے مرد اور عورت میں موجود ہے۔ متمدن ممالک میں عورتیں سارے حقوق لینے کے باوجود مردوں کے زیر بار رہتی ہیں کیونکہ یہ دنیا مرد چلاتے ہیں۔ پاکستانی عورت کو اپنے حقوق کے مطالبے سے پہلے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے، وہ ابھی تک جہالت کی زندگی بسر کرتی رہی ہیں اور اپنی ناراضگی کو مرد کے خلاف ایک حربے کے طور پر استعمال کرتی ہیں جو ایک معاشرتی ہلاکت ہے۔ انہیں پاکستانی مردوں سے پنجہ آزمائی کرنے کی بجائے افہام کی ایک سطح خلق کرنی چاہیئے کہ زندگی کو کس طرح ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

پاکستانی مردوں کے جنسی رویے

اگرچہ پاکستان کی نصف کے قریب آبادی عورتوں پر مشتمل ہے اس کے باوجود یہ مردوں کے لئے جنسی تشنگی کا معاشرہ ہے۔ یہاں جنسی خواہش کی تسکین کے دو ہی مسلمہ راستے ہیں: شادی یا پیشہ ور عورتوں سے ربط۔ یہ دونوں راستے بہت مشکل ہیں کیونکہ دونوں کا تعلق مرد کی اقتصادی حالت سے ہے۔ پاکستان کی نوے فیصد آبادی اقتصادی بدحالی میں مبتلا ہے اس لئے جنسی سطح پر بھی پاکستانی معاشرہ اندرونی طور پر بحران کا شکار ہے۔ جنس اور اقتصادی قوتیں ایک دوسرے سے منتھی ہوتی ہیں۔ اس ایشوع کے بارے میں شاذ و نادر ہی لب کشائی کی جاتی ہے کیونکہ یہاں جنس کے بارے میں گفتگو کرنا فحاشی تصور کیا جاتا ہے۔ اسی امتناع کی وجہ سے اس پر کچھ لکھنا یا نفسیات کے موضوع پر جنس کو زیر بحث لانا اتنا مستحسن تصور نہیں کیا جاتا۔ ہمارے اندر اتنی نفسیاتی رکاوٹیں پیدا ہو چکی ہیں کہ ہم جنس پر لکھتے ہوئے انسان کے جنسی اعضا اور اس سے متعلق دوسرے معاملات کے ذکر سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے لئے ہمارے پاس مناسب vocublary بھی نہیں ہے اس لئے انگریزی کی اصطلاحوں سے کام چلاتے ہیں۔ یہ ہماری ایک inhibition ہے جس سے رہا ہونا ضروری ہے۔ جنس کے بارے میں ہم کافی شرمیلے ہیں۔ اسے وضع داری اور شرافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس طرح شادی شدہ عورتیں اپنے جنسی امراض کے علاج کے لئے مرد گائینوکولوجسٹ کے سامنے حجاب کے بغیر کپڑے اتار

دیتی ہیں کیونکہ علاج اور صحت مقصود ہوتی ہے۔ اسی طرح نفسیاتی علاج میں بھی اپنی شخصیت کو برہنہ کیا جانا ضروری ہے کہ اصل معاملے کی کنہ تک پہنچا جا سکے۔ جنس کے intimate معاملات تک رسائی حاصل کر کے ان نفسیاتی الجھنوں کا مداوا کیا جائے جو انسان کو لاشعوری طور پریشان رکھتی ہیں۔ وجود جنس کے حوالے سے اپنی شرح کرتا ہے' یہ محض جسمانی کھیل نہیں ہے' اس کے عقب میں بہت سے رویے کارفرما ہوتے ہیں۔

بڑے بڑے ماہرین نفسیات نے انسانی سائیکی کا جو سٹرکچر بیان کیا ہے' اس میں شعور اور لاشعور شامل ہوتے ہیں۔ انسان کی شخصیت میں بہت سا ایسا مواد بھی ہوتا ہے جو شعور اور لاشعور کی زد میں نہیں ہوتا اور خوابیدہ رہتا ہے' یہ اتنا طاقت ور نہیں ہوتا کہ اپنے آپ کو دھکیلتا ہوا باہر نکل آئے۔ تاہم فرد کی زندگی میں ایسے غیر معمولی لمحات ہوتے ہیں جب وہ ایک لاوے کی طرح بدن کو دھکانے لگتے ہیں۔ فرد کی کچھ خواہشیں اپنی ہوتی ہیں اور کچھ معاشرے میں دیکھادیکھی فرد کے اندر خاموشی سے اتر جاتی ہیں۔ یہاں فرائیڈ یا یونگ کے لاشعور کے نظریات کا اعادہ نہیں کیا جا رہا بلکہ ان عناصر اور تاثرات کی نشاندہی مقصود ہے جو ہمارے شعور کی تینوں سطحوں سے باہر ہوتے ہیں اور موقعہ ملنے پر کسی سے اجازت لئے بغیر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

فرد کی جنسی خواہش اس زمرے میں نہیں آتی کیونکہ یہ دوسری جبلتوں کے مقابلے میں یہ بہت زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔ عام خیال ہے کہ جنسی خواہش اور اس کی تکمیل پانچ منٹوں یا اس سے کم وقت کا کھیل ہے اسے بیجا اہمیت دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ بات اتنی سیدھی نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ جنسی رویہ زندگی کو بسر کرنے کا ایک رویہ بھی ہے۔ عام زندگی میں دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ اپنی بیویوں یا عورتوں کے گرد دیوانہ وار گھومتے ہیں ان کی ہر ممکن یا ناممکن خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عورتوں کے نام جائیدادیں منتقل

کرتے ہیں' ان کی ہر خوشنودی کا خیال رکھتے ہیں۔ اگر وہ یہ نہ بھی کریں تو وہ ان کے بدن تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مرد کا یہ رویہ ایک دوسرے وجود کو زیر کرنے کے لئے ہے۔ یہ ایک دوسرے کے افہام کی کوشش ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ازاربند کا غلام ہے' وہ اپنے وجود کے ایک رخ کو interpret کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں مرد کے لئے جنس ایک مصیبت سے کم نہیں ہے۔ یہاں جنسی خواہش کا اطمینان داؤ لگنے کے مترادف ہے اور عورت تک رسائی کے لئے جو چور راستے ہیں وہ کافی توہین آمیز ہوتے ہیں' ہر حساس آدمی ان چور راستوں پر جانے کی بجائے دستبرداری کو ترجیح دیتا ہے۔ دوسری طرف پاکستانی عورتوں کو اپنے عورت ہونے پر بہت ناز ہے وہ اپنی اس حیثیت کو پوری طرح کیش کراتی ہیں کیونکہ انہیں احساس ہے کہ مردوں کو ان کے بدن کی ضرورت ہے۔ غیر شادی شدہ نوجوان عمر کا بیشتر حصہ اس داؤ لگنے کے چکر میں صرف کرتے ہوئے دوسرے زیادہ اہم کاموں اور منصوبوں سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ کام کرتے ہیں اس میں دلجمعی نہیں ہوتی۔ ایک تشنہ اور بھوکے آدمی کی نفسیاتی حالت ایک مطمئن آدمی کی نسبت مختلف ہوتی ہے۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ امریکی اور مغربی ممالک کے سفارتخانوں نے اپنے ممالک کی خواتین سیاحوں کو وارننگ دی ہے کہ وہ پاکستان میں سکرٹ پہن کر سفر نہ کریں۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ غیر ملکی سفید فام خواتین سیاح اول تو پاکستان میں سیاحت کے لئے آتیں نہیں' اگر آتیں ہیں تو پتلونوں اور شلواروں میں سہمی سہمی پھرتی ہیں۔ یہ رویہ بیحد معنی خیز ہے اور عورت کے بارے میں ہماری اجتماعی سائیکی کا مظہر ہے ۔ یہ نہیں کہ پاکستان میں عورتوں کی کمی ہے حالانکہ نصف کے قریب آبادی عورتوں پر مشتمل ہے۔ یہ بات بھی نہیں کہ ہم اتنے مذہبی اور پاکباز ہیں کہ ہمیں کسی سفید فام کی ٹانگیں اور ابھرے ہوئے نیم برہنہ سینے پسند نہیں ہیں۔ مسئلہ کچھ اور ہے' اور وہ مسئلہ نارسائی کا ہے' بھوک کا ہے ۔

پاکستانی مردوں کی sexuality پر بات کرتے ہوئے ہم اس کا تقابل مغربی ممالک کے معاشروں یا لوگوں سے نہیں کر سکتے کیونکہ ہماری ، ثقافتی 'معاشرتی اور تاریخی صورتحال دوسرے ممالک سے بالکل مختلف ہے۔ جنوبی ایشیا محتاجی' محرومی اور دوری کا خطہ ہے۔ فرائیڈ' یونگ 'ایڈیلر یا دوسرے ماہرین نفسیات جب فرد کے جنسی رویے کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر آزاد معاشرے تھے جہاں مرد اور عورت کی دوستی یا ملاقات کو جرم یا بے حیائی تصور نہیں کیا جاتا تھا جہاں سکولوں اور کالجوں میں مخلوط تعلیم کے ذریعے دو جنسوں کو ایک دوسرے کو بہتر طریقے سے سمجھنے کا موقعہ ملتا ہے اور اس طرح ہر دو جنسیں ایک دوسرے کے لئے عجوبہ نہیں ہیں۔ پاکستانی معاشرہ بیحد ثنویت کا معاشرہ ہے۔ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارا معاشرہ ایک مذہبی ملک کا معاشرہ ہے اس لئے یہاں مرد اور عورت کو ملاقات کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ عورتیں گھر سے باہر اکیلی نہیں نکل سکتیں' وہ کسی غیر مرد سے بات نہیں کر سکتیں' اگر بات کرتی بھی ہیں تو اس کا مطلب جنس sex ہے۔ دوسری طرف کھلم کھلے مجرے اور جسم فروشی کا عمل جاری ہے۔ جس طرح عورت پر بہت سی معاشرتی قدغنیں ہیں اسی طرح مرد بھی ان کی قیود سے آزاد نہیں ہے' جو کچھ باہر معاشرے میں بیت رہا ہے اس کے نقش کسی نہ کسی صورت میں "فرد کے باطن میں مرتب ہو رہے ہیں۔ جو معاشرہ غایت درجے کا repressive ہو گا اس میں رہنے والے لوگوں کے رویے بھی مختلف ہوں گے۔

جب معاشرہ جنسی خواہش کو بے حیائی تصور کرتا ہو اور دوسری طرف ابتدائی جوانی میں جنسی خواہش کا وفور ہو تو پھر فرد کے لئے کیا راستہ ہے؟ اگر اسے راستہ نہیں ملے گا تو مایوسی' نراج' تشدد اور نہ جانے کون کون سے رجحانات اس کے اندر پلیں گے ۔ ظاہر ہے کہ اس عمر میں شادی ممکن نہیں ہے اور ہر کسی کے پاس اتنے مالی وسائل نہیں ہوتے کہ وہ شادی کا جھنجھٹ مول لے۔ معاشرہ عورت سے ملاقات کی اجازت نہیں دیتا خواہ وہ کتنی ہی معصومانہ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ نوجوانوں

کا کسی طرح Catharsis ممکن نہیں ہے۔ تیسری دنیا کے معاشروں میں کچھ اس قسم کی صورتحال ہے لیکن پاکستانی معاشرہ حسب ضرورت مذہب کو استعمال کرتا ہے۔ وہ ہر معاملے میں مذہب کی حاکمیت کا اعلان کرتا ہے لیکن لوگوں کے افعال مذہب کی روح اور اس کی ہدایت کی نفی کرتے ہیں۔ ہم روزانہ ٹیلیوژن اور ریڈیو پر کلام پاک کی تلاوت اور ترجمہ سنتے ہیں' اقبال اور قائداعظم کے فرمودات کو بڑی رقت سے دوہراتے ہیں لیکن اس کے باوجود معاشرے کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ یہاں کرپشن سے لے کر ذاتی عقائد تک کسی بات میں صداقت نہیں ہے۔ ہم ہر لمحے سرکاری اور شخصی سطح پر جھوٹ کی ضیافت سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف عملی سطح پر شدید معاشی بحران اور ملازمتوں کی نایابی اور تعلیم یافتہ کے بیکار نوجوانوں کا جم غفیر معاشرے میں منفیت کو دعوت دیتا ہے۔ اس صورتحال میں جنسی تشنگی بیحد بے اطمینانی کی علامت بن کر فرد کو تاراج کر دیتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑے اجتماعی المیے کی نشاندہی کرتی ہے جس کی طرف کوئی متوجہ ہونا نہیں چاہتا۔ اس گھٹن کی ایک وجہ ہمارے معاشرے میں سوشل انٹرایکشن کا نہ ہونا ہے۔ کوئی ایسی عمومی تہوار نہیں' نہ ہی ایسی تفریح گاہیں ہیں جہاں لوگ آپس میں مل کر روابط قائم کر سکیں۔ جو تفریح گاہیں' ریستوراں اور کلبس ہیں وہ صرف حق یافتگان کے لئے ہیں۔ اگر کبھی تفریح کے مواقع پیدا ہوتے ہیں تو وہاں اتنی زیادہ غنڈہ گردی اور بدتمیزی کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ ہر شریف النفس پناہ مانگتا ہے۔ یہاں معاشرتی ربط صرف فنکشل ہے کلچرل نہیں ہے۔ اس صورتحال سے فرد پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ منفی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ اپنے اندر سکڑنے لگتا ہے۔ اس پژمردگی کی حالت میں وہ اپنے ہیجان کو ختم کرنے کے لئے کس طرح دوسری صنف کو ڈھونڈ سکتا ہے جو اس سے بھی زیادہ خوف زدہ ہوتی ہے۔ اگر ملاقات ہو بھی جاتی ہے تو وہ چوری چھپے جرائم پیشہ لوگوں کی طرح ہوتی ہے اور ہر وقت دیکھے جانے کا خوف غالب رہتا ہے۔ عورت یا لڑکی بھی جذباتی سطح پر ملنے کی

بجائے اس دھڑکے میں مبتلا ہوتی ہے کہ مرد سے تعلق سے کہیں وہ حاملہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس قسم کے متصورہ خدشات میں جنسی خواہش کا وفور اس کی ذہنی صحت اور معاشرتی رویے کو متاثر کرنے لگتا ہے۔ نوجوان بتدریج sexual atrophy کا شکار ہو جاتا ہے اور اس میں عورت میں رغبت کم ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بعد میں اس کی شادی شدہ جنسی انجماد کا باعث بھی بنتی ہے۔ ان خارجی نا مساعد حالات کے باوجود اس کی اڈ اور لیبڈو اسے پریشان کرتی رہتی ہیں۔ چنانچہ وہ خواہش کے ہاتھوں غیر فطری راستے پر جا نکلتا ہے جن میں امرد پرستی اور خود لذتی ہے جو بعض کے نزدیک نرگسیت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ خود ہی اپنی لذت اور تشفی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ جنسی سطح پر تشنگی کا معاشرہ ہے۔ یہاں جنسی زندگی کا آغاز عام حالات میں تیس برس کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے داؤ لگانا یا طوائف سے مواصلت ہے۔ پاکستانی طوائفیں جسم فروشی کی نزاکتوں اور فن سے آشنا نہیں ہیں۔ اس کے باوجود پاکستانی معاشرے کے تمام طبقے ظاہری پابندیوں کے باوجود کرائے کی عورتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ عورتیں اپنے فن میں اتنی بھونڈی ہوتی ہیں کہ ان سے جنسی ربط کراہت پیدا کرتا ہے۔ پاکستانی نوجوانوں کی اکثریت کو اپنی جوانی کا بھرپور وقت ایک کنوارے کی طرح بسر کرنا پڑتا ہے۔ جب کبھی کوئی عورت یا اپنی بیوی ان کے ہاتھ لگ جاتی ہے تو اس کی حالت ناگفتنی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی گھروں میں بچوں کی طویل قطاریں نظر آتی ہیں۔ اگر پاکستانی عورت جنسی طور پر نابلد ہے تو پاکستانی مرد کا جنسی رویہ ایک جانور جیسا ہے جسے تہذیب کی ضرورت ہے۔ اس صرف اپنے اطمینان سے دلچسپی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے رویے کی وجہ سے بیشتر عورتیں غیر مطمئن رہتی ہیں۔

جنسی خواہش کا وجود اور اس کی نمود زندگی کی تین منزلوں یعنی ابتدا جوانی'

اور بڑھاپے میں مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔ ابتدائے جوانی میں یہ ایک منہ زور وحشت ہوتی ہے جس کے اشتعال کے لئے کسی خارجی معروض کی ضرورت نہیں ہوتی' یہ اپنے انعکاس کے لئے کوئی راستہ ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوشش کرتی ہے۔ جنسی خواہش کی دوسری منزل میں یعنی جوانی کے دوران تحریک کے لئے اسے معروض کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک خوبصورت عورت یا ایک عورت کا سڈول بدن جنسی خواہش کو تحریک دیتی ہے' ایک ٹارگٹ کی نشاندہی کرتی ہے۔ عورتوں کو بھی اس کا احساس ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے بناؤ سنگھار پر بہت توجہ دیتی ہیں۔ پاکستان میں حسن کی شدید کمی ہے' عورتیں اپنے آپ کو اس طرح ملفوف کرتی ہیں کہ متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ مرد کی جنسی خواہش میں تحریک کم ہو جاتی ہے۔ زندگی کی تیسری منزل یعنی زوال بدن کے ساتھ جنسی خواہش پسپائی پر ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود مرد اس کی تسکین چاہتا ہے اسے نظر انداز نہیں کرتا۔۔ اس قسم کی کلچرل آب وہوا' جس میں مرد اور عورت کو دور رکھا جائے' جنس کے اظہار کے لئے ناسازگار ہوتی ہے اور طرح طرح کی نفسیاتی بیماریوں کا موجب بنتی ہے۔ پاکستان میں چونکہ نفسیاتی بیماریوں اور ان کے علاج کا تصور نہیں ہے اس لئے آبادی کی ایک وسیع تعداد Psychological disorder میں مبتلا ہے جس کے آئے دن مظاہر ہم اپنی معاشرتی زندگی کے کاروبار اور سیاسی عمل میں دیکھتے ہیں۔ اس ذیل میں بلیو فلموں کا وسیع پیمانے پر کاروبار' جو مرد اور عورتیں چوری چھپے بڑے اشتیاق سے دیکھتے ہیں' اور دن بدن ویاگرہ گولیوں کا فروغ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ تشنگی کا یہ معاشرے ہر قسم کی بندش توڑنے پر آمادہ ہے لیکن نفسیاتی خوف کا شکار ہے۔

زندگی میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ ذہنی طور پر تخلیقی ہوتے ہیں وہ جنسی خواہش کے عدم اطمینان کو idealize کر لیتے ہیں وہ اپنے اعصاب پر تخلیقی عمل کی دھن اتنا سوار کر لیتے ہیں کہ اسے بھول جاتے ہیں اور اپنے مشغلے میں انتہائی

مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عورت کے بارے میں بھی پاکستانی مردوں کا رویہ لوٹ کھسوٹ کا ہے جہاں مل جائے کوئی دریغ نہیں کیا جاتا۔ یہاں اجتماعی ریپ کی یا نا عمر بچیوں کے ساتھ جنسی واردات کی گھناونی وارداتیں اسی نفسیاتی کیفیت کی مظہر ہیں۔پاکستانی معاشرے میں جنسی کلچر کی تہذیب کی ضرورت ہے' انتہائی جذباتی لمحات میں بھی اس کے اندر کے حیوان کو بھی سدھانے کی ضرورت ہے۔ ایک صحت مند نفسیاتی فضا پیدا کرنے کے لئے مرد اور عورت میں تعلق کی سہولتیں پیدا کرنا ہے اور یہ بھی بتانا ہے کہ مرد عورت جنس کے علاوہ انسانی سطح پر بھی ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ اس طرح پاکستانی مرد اور عورت میں ایک دوسرے کے بارے میں جو apprehensiveness ہے اسے کم کرنا ہے۔

شادی، آبادی ،خانہ بربادی

پیدائش، شادی اور موت انسانی زندگی کے تین بنیادی مرحلے ہیں۔ پیدائش اور موت پر انسان کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ وہ اس دنیا میں اپنی مرضی سے نہیں آتا اور نہ ہی رخصت ہوتا ہے۔ شادی پیدائش اور موت کو مربوط کرتی ہے۔ اس کے ذریعے انسان اپنی وضاحت کرتا ہے اور اس کے وہ رویے منظرعام پر آتے ہیں جو خود اس سے اوجھل ہوتے ہیں۔۔ اس کے برعکس انسانوں کی ایک ایسی تعداد بھی ہے جو شادی سے انکار کرتی ہے۔ یہ ایک انتہائی ذاتی فیصلہ ہے جو خاص حالات میں (دائمی بیماری، انتہائی عسرت، اپنی ہیئت کذاتی کا شدید احساس، نفسیاتی خلل، محبت میں ناکامی وغیرہ) کیا جاتا ہے۔ لیکن جو شخص ہر طرح سے ثابت و سالم ہونے کے باوجود شادی سے انکار کرتا ہے وہ انسانی زندگی کی معنویت کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ اپنے کنوارپن کو ایک اثاثہ سمجھتا ہے، وہ اپنے آپ کو تقسیم کرنا نہیں چاہتا۔ ایک غیر شادی شدہ شخص اور ایک لاولد شخص کے مزاجوں میں ایک طرح کی سنکیت آجاتی ہے وہ ہر معاملے میں بیحد کرٹیکل ہوتے ہیں۔ اگرچہ شادی نہ کرنا ایک ذاتی فیصلہ ہے لیکن اردگرد کے لوگ اصل حقیقت جانے بغیر غیر شادی شدہ شخص کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ رشتہ دار، دوست عزیز، دفتر کے رفقائے کار سب اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کوئی اسے نامرد سمجھتا ہے، کوئی اسے خاموش تماش بین کہتا ہے، کوئی کچھ۔ مرد سے زیادہ غیر شادی شدہ عورت کی زندگی

یرن ہو جاتی ہے۔ اس پر بھی طرح طرح کی تہمتیں لگائی جاتی ہیں، جاننے والے اس کے والدین کو تلقین اور طعنے دونوں طرح سے انہیں لڑکی کے غیر شادی شدہ ہونے کا احساس دلاتے ہیں اور زیر لب اس کے بے راہرو ہونے کا اشارہ بھی کرتے ہیں۔ ایک غیر شادی شدہ عورت پاکستانی معاشرے میں اپنے لئے اور معاشرے کے لئے ایک خطرہ بن جاتی ہے۔ مردوں کی نسبت خواندہ طبقے کی کریئر وومن میں شادی سے انکار کی تعداد زیادہ ہے۔ عورتیں ہمیشہ رومانویت اور آڈیلیزم میں مبتلا ہوتی ہیں۔ وہ خوبصورت، دولتمند، نیک سیرت اور devoted قسم کا شوہر چاہتی ہیں جو انہیں زندگی کا ہر آرام مہیا کر سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری صفات ایک فرد میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس قسم کا آئیڈیلیزم عموماً ٹین ایجز میں بنتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اسے rationalize ہونا چاہئے۔ عورتوں میں اپنے بارے میں معروضیت کم ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے آئیڈیلز کو نا قابل حصول دیکھ کر شادی سے انکار کرتی ہیں۔ کیریئر وومن کالجوں یا ادارے کے ہاسٹلوں میں رہ کر اپنے خانگی زندگی سے دور ہوتی ہیں۔ جنس محض بدن کی ایک خواہش نہیں یہ زندگی کو سمجھنے اور اس تک پہنچنے کا ایک رویہ ہے جو شخصیت کے دوسرے رویوں کو متاثر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص جو جنسی طور پر بالکل ناآسودہ ہے اس میں جارحیت زیادہ ہو گی، دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ جنسی تشنگی کی حالت میں رد عمل کے طور پر وہ زندگی سے بتدریج withdraw کر جائے۔ حقیقت میں ایک مرد کے جنسی رویے کے بارے میں وہ عورت ہی بتا سکتی ہے جس سے وہ ہمبستر ہوتا ہے۔ اگر وہ بالکل مجرد ہے تو اس کی حالت کا اندازہ اس کے مجلسی رویے سے لگایا جا سکتا ہے۔ فرائیڈ نے جنس کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے بلکہ اسے انسانی کارکردگی کا محور قرار دیا ہے جو محل نظر ہے۔ سکندر اعظم کا دنیا فتح کرنے کا منصوبہ، کارل مارکس کا داس کیپٹل لکھنا یا انسان کا چاند پر جانا کیا ان سب کا محرک جنسی خواہش تھی؟ جواب نفی میں ہے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی شخصیت میں جنسی خواہش ایک زبردست قوت

ہے جو بعض اوقات انسان کو غیر معمولی کارناموں پر آمادہ کرتی ہے۔ بعض مرد جنسی طور پر بیحد فاعل ہوتے ہیں اور بعض مرد جنسی طور پر کاہل یا کمزور ہوتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں کا تعلق مرد کے جنسی گلینڈز، ان سے پیدا ہونے والی رطوبتوں اور اس کے اعصابی نظام سے ہے جن کو اس کا ذہن کنٹرول کرتا ہے۔ ان عوامل کے علاوہ اور بہت سے دوسرے واقعات اور محرکات ہوتے ہیں جو مرد کی جنسی خواہش اور اس کے وجود کے اظہار کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس کے بچپن میں اس کے اردگرد موجود عورتوں کا رویہ اس کے لاشعور میں جاگزیں ہوتا رہتا ہے۔ ایک غصیلی ماں جو بچے کے باپ سے ہر وقت بد سلوکی کرتی ہے وہ بچے کے ذہن میں عورت کے لئے خوف کے احساس کو جنم دیتی ہے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ جب فرد مسلسل جنسی عمل سے دور رہتا ہے تو اس کے اندر جنسی انجماد کی حالت پیدا ہونے لگتی ہے، اور اس کی عورت کے لئے رغبت معدوم ہو جاتی ہے۔ یہ صورتحال شخصیت کے کرائسس کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ آجکل کے حالات میں ہر کوئی شادی نہیں کر سکتا کیونکہ اب یہ خالصتاً اقتصادی مسئلہ بن چکا ہے۔

تمام معاشرے شادی کے ادارے کو قبول کرتے ہیں بلکہ فرد کو بامعنی اور پُر سکون زندگی بسر کرنے کا ایک راستہ بتاتے ہیں، یہ راستہ انسان کو کس طرف لے جاتا ہے یہ بعد کی بات ہے۔ کسی زمانے میں پاکستانی معاشرے میں شادی کے ساتھ ایک طرح کا تقدس بھی شامل تھا۔ خاندان کے بڑے بڑی سوچ بچار کے بعد شادی کا فیصلہ کیا کرتے تھے لیکن اب معاملات اور حالات بدل گئے ہیں۔ پاکستان میں اقتصادی بدحالی، معاشرتی بد امنی، جرائم کی زیادتی، دولت کی بے پایاں خواہش، زندگی کی کم سے کم ضرویات پورا کرنے کے لئے جسم فروشی سے سرکاری رازوں کی فروخت تک، شہری حقوق اور تہذیب کے فقدان نے پاکستان میں معاشرے کی تشکیل نہیں ہونے دی۔ یہاں زندگی کے کسی شعبے میں قانون کی حکمرانی نہیں ہے۔ دوسری

طرف غیر ممالک میں پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد کی ہجرت اور ان کی کمائی ہوئی دولت کے پاکستان میں انتقال نے معاشرے کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اس دولت سے ایک نیا متمول طبقہ پیدا ہوا ہے جو بنیادی طور پر ناخواندہ ہے لیکن غیر ملکی آمدنی نے انہیں تونگر بنا دیا ہے۔ اس عمل سے جو اقداری نظام سامنے آیا ہے اس میں نمود و نمائش اور شیخی کا عنصر بہت زیادہ ہے اور اس نے پاکستان کی معاشرتی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ شادی ایک خاندان بنانے کے لئے کی جاتی ہے جس سے انسان کی جنسی خواہش کی تسکین بھی ہوتی ہے۔ شادی ایک باقاعدہ اور نارمل زندگی بسر کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ شادی کرنے کی یہ وجوہات نہایت معقول اور عملی ہیں۔ شادی کا یہی تصور جب عملی دنیا میں آتا ہے تو کافی بدل جاتا ہے۔ اس میں افراد کی مزاجی خصلتیں اور معاشرے لی بہت سی توقعات کا دخل ہے جو بدلنے کا وعدہ کرتے ہوئے بھی نہیں بدلتا۔ اس رویے کے پیش نظراب افراد شخصی انقلاب میں یقین رکھتے ہیں جو جرات مند ہیں وہ رسوم کو تج کر' لوگوں کے طعنے سنتے ہوئے من مانی کرتے ہیں۔

پاکستانی معاشرے میں شادی ایک جد و جہد سے کم نہیں ہے۔ شادی کے دو مروجہ طریقے ہیں۱۔ والدین کی طرف سے طے شدہ شادی۲۔ اپنی من پسند کی شادی۔ دونوں طرح کی شادی کم کم کامیاب ہوتی ہیں' آپ کہہ سکتے ہیں کہ لاکھوں اور کرڑوں شادی شدہ جوڑے پر امن زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بادی النظر میں یہ بات درست دکھائی دیتی ہو لیکن اگر ہم یہاں خانگی زندگی کی تہہ میں اتر کر دیکھیں تو اتنے لا ینحل تضادات ہیں کہ ان کا بظاہر کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اتنی زیادہ نارا ضگیاں ہیں جنہیں بعمل مجبوری برداشت کیا جاتا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں آجکل شادی کی بنیاد فریب' جھوٹ اور تاجرانہ ذہن پر ہے۔ شادی کی ایک تیسری قسم اپنے نہایت قریبی رشتہ داروں یعنی چچا زاد' ماموں زاد وغیرہ سے شادی۔ عیسائیوں میں فرسٹ کزن سے شادی کی اجازت نہیں ہے جبکہ اسلام اس کی اجازت

دیتا ہے۔ کزن میرج کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ ان میں پہلی ذات برادری میں شادی کر کے مستقبل کے خدشات سے بچنا ہے۔ اس کے علاوہ متمول طبقہ اپنے اثاثوں کو بچانے کے لئے قریبی رشتہ داروں سے شادی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان تحفظات کے باوجود قریبی رشتوں میں بھی طلاقیں ہوتی ہیں اور جائیدادوں کے جھگڑے چلتے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے یہ بات بھی منظر عام پر آئی ہے کہ سندھ اور بعض دوسرے علاقوں میں بڑے بڑے زمیندار اور تمن دار اپنی جاگیریں بچانے کے لئے لڑکیوں کی شادیاں قران مجید سے کر دیتے ہیں۔ یہ تمام رویے اس تصور کو تقویت دیتے ہیں کہ شادی کے معاملے میں پہلی بات مالی تحفظ ہوتا ہے اور انسانی جذبات کی بات بعد میں آتی ہے۔

پاکستان میں چونکہ سوشل انٹرایکشن بہت کم ہے اس لئے ہر گھر ایک جزیرہ بن چکا ہے۔ اس لئے رشتوں کی تلاش بھی اک بہت بڑی مشکل بن گئی ہے۔ اب وچولن کا دور گزر گیا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح یہاں بے شمار میرج بیوروز کھل گئے ہیں لیکن اس شعبے میں بھی بددیانتی' جھوٹ اور فریب کی وجہ سے شاید ہی کسی خوش نصیب کی شادی اس کے حسب منشا ہوتی ہے۔ یہ ادارے اتنے مہنگے ہیں کہ عام آدمی کی بساط سے باہر ہیں۔ میرج بیوروز جن کو زیادہ تر عورتیں چلاتی ہیں جو لوگوں کی نفسیاتی مجبوریوں کا پوری طرح استحصال کرتی ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں شادی کی شروعات بھی عجیب و غریب طریقے سے ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ذات پات کا مسئلہ آتا ہے۔ کم سے کم نوے فیصد خاندانوں کی بنیادی شرط ہوتی ہے کہ شادی ان کی ذات برادری میں ہو۔ جب یہ ممکن نہیں ہوتا تو پھر وہ انتظار کرتے ہیں جب لڑکی کی عمر بڑھنے لگتی ہے تو پھر ہر ذات برادری کو قبول کر لیتے ہیں۔ اگر لڑکے یا لڑکی کی مالی حیثیت بہت اچھی ہے تو ذات برادری کی شرط ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ ابھی یہ مسئلہ طے ہوا نہیں ہوتا کہ دونوں جانب سے ایک دوسرے کی مالی حیثیت کا جائزہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر لڑکی خوبصورت ہے اور خوشحال خاندان سے

ہے تو پھر لڑکی والے منہ بولی قیمت مانگتے ہیں کہ لڑکے کو ڈی ایم جی گروپ سے ہونا چاہئے یا بڑا بزنس مین ہونا چاہئے۔ دوسری طرف لڑکے والے لڑکی کے والدین کی مالی حیثیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ شادی سے متعلقہ دوسرے معاملات یعنی حق مہر اور جہیز وغیرہ بالکل کاروباری انداز میں طے ہوتے ہیں' فریقین ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تضادی صورتحال ہے۔ ایک طرف شادی ایک خاندان بنانے کے لئے کی جاتی ہے کہ فرد معاشرے میں شامل ہو کر زندگی کو ایک نارمل طریقے سے بسر کرسکے دوسری طرف ہردو کا رویہ تاجرانہ ہوتا ہے۔

ازدواجی زندگی میں محبت کے عنصر کو ضروری سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ محبت ازدواجی زندگی کو کامیاب بناتی ہے۔ ایک دوسرے کی پاسداری یا افہام و تفہیم کو محبت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ خوش اخلاقی ہے محبت کی بہت سی قسمیں بیان کی جاتی ہیں ۔ محبت مرد اور عورت کے درمیان کسی واضح وجہ کے بغیر کشش ہوتی ہے' اس کا منتہٰی اتصال ہوتا ہے۔ فرائیڈ محبت کو جنسی عمل کا پہلا قدم کہتا ہے۔ میاں اور بیوی میں محبت کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اگر شادی سے پہلے مرد اور عورت میں محبت ہے تو اس کا منتہٰی شادی ہے۔ شادی کے بعد یہ کشش ماند پڑ جاتی ہے۔ اگر یہ محبت کی شادی نہیں ہے تو دو اجنبی مرد اور عورت کس طرح محبت کرسکتے ہیں جب کہ ان کے تعلق اور تعارف کی ابتدا ہی جنسی عمل سے ہوتی ہے۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محبت جسمانی ہوتی ہے۔ مغربی ممالک میں محبت کا تصور کچھ مختلف ہے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے سے پہلے محبت کرتے ہیں' کسی حجاب کے بغیر ہمبستری بھی کرتے ہیں' جب وہ خاندان بنانے کے خواہشمند ہوتے ہیں تو شادی کر لیتے ہیں۔

عام حالات میں شادی خانہ آبادی کے لئے کی جاتی ہے کہ ایک طرف مرد اور عورت کی جذباتی اور جنسی زندگی متوازن رہے اور دوسری طرف وہ اولاد کے ذریعے مستقبل میں سفر کریں۔ ہر فرد کا اپنا مقصد حیات ہوتا ہے جس کے لئے وہ جد

وجد کرتا ہے۔ یہ زندگی کے بارے میں عام سا مشاہدہ ہے لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ زندگی الجھنوں کا نام ہے۔ ابھی ابھی میاں اور بیوی میں جس خوشگوار تناسب کا ذکر کیا گیا ہے وہ عام طور پر قائم نہیں رہتا خاص طور پر ان معاشروں میں جن کی ایک نمایاں مثال پاکستانی معاشرہ ہے جس میں لوگ ایک دوسرے کے رقیب کے طور پر رہتے ہیں اور جہاں ایک دوسرے کو زیر کرنے کا عمل پیہم جاری رہتا ہے۔ ایک دوسرے کی عزت رواداری اور انسانی جذبات کی پاسداری نامی چیز یہاں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ یہاں کسی شہری کی کوئی عزت نہیں ہے' ریاستی مشینری کا اہلکار ہو یا دکاندار عام شہری کو روندنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہوتا ہے۔ اس معاشرتی صورتحال نے سب سے زیادہ خانگی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو مالی اور اقتصادی سطح پر تولتا ہے' ہر کوئی ایک دوسرے کو افادی سطح پر تسلیم کرتا ہے۔ ہمارے جذباتی اور معاشرتی ڈھانچے کے اندر دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ ہمارے گھروں میں افتراک آ چکا ہے' بیویاں جو کبھی ایثار کی مثال ہوتی تھیں اب پیہم مطالبہ کرنے والی جفا جو ہیں' اب وہ طلاق کی دھمکی وصول کرنے کی بجائے خلع کی دھمکی دیتی ہیں' خاندان کے اندر یک جہتی اب خود غرضی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس سارے خلفشار اور تمدنی پیٹرن کو بدلنے کے لئے اور مثبت زندگی بسر کرنے کے لئے ہمیں کسی معجزے کا انتظار ہی کرنا پڑے گا یہ اصلاح نہ کوئی فوجی حکومت کر سکتی ہے اور نہ ہی جمہوریت کا غوغا کرنے والے۔۔

شادی تو اس لئے کی جاتی ہے کہ گھر آباد ہو' زندگی میں توازن اور سکون ہو لیکن ان باتوں کا براہ راست تعلق ہماری معاشرتی زندگی سے ہے کیونکہ جو کچھ باہر بیت رہا ہے ہماری جذباتی زندگی اس سے ماورا نہیں ہو سکتی کیونکہ انسان فرشتہ نہیں ہے اس میں بدی کی طرف راغب ہونے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف انسان ہر معاملے میں سب سے زیادہ اپنے مفاد کو مقدم رکھتا ہے۔ مرد شادی اپنے لئے کرتا ہے اس کا مقصد معاشرے کی اصلاح یا عورتوں کو آباد کرنا نہیں ہوتا' وہ

سب کچھ اپنے لئے کر رہا ہوتا ہے۔ وہ عورت کو زیورات، ملبوسات اور حق مہر وغیرہ دے کر گھر لاتا ہے۔ سنی حضرات کے نزدیک وہ بعض شرائط پر بیوی کو خریدتا ہے۔ آج بھی عربوں میں شادی سے پہلے لڑکی کے باپ کو لڑکی کی قیمت لڑکے کو ادا کرنا ہوتی ہے۔ اس کے بعد کے بھی سارے اخراجات لڑکے کو ہی اٹھانے ہوتے ہیں۔ جو مرد اتنے مصارف کے بعد عورت کو گھر لاتا ہے کیا وہ اس کو اپنے مساوی حقوق دینے پر آمادہ ہو جائے گا؟ شاید نہیں، کیونکہ مرد عام طور پر عورت کی حاکمیت کے منکر ہوتے ہیں۔ شادی میں عام طور پر مکان آباد ہوتے ہیں اور بیشتر حالتوں میں دل بے آباد رہتے ہیں۔

علیحدگی کی زندگی

طلاق ایک خانگی زندگی کا بحران ہے' یہ ایک خانگی زندگی کے خاتمے کا اعلان ہے' یہ ایک گھر کے بکھر جانے کا عمل ہے جو درد ناک ہے۔ یہ نہ صرف دو خاندان کو تباہ کرتی ہے بلکہ اولاد کے راستے میں بھی کانٹے بکھیرتی ہے۔۔ معاشرتی سطح پر طلاق کو ایک معیوب فعل سمجھا جاتا تھا۔ اگر مرد کی طرف سے طلاق کا ارادہ ظاہر کیا جاتا تو عورت کا سارا خاندان لڑکے اور اس کے والدین کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا۔ عزیز و اقارب کو درمیان میں لایا جاتا' مرد کو دھمکیاں بھی دی جاتیں کہ وہ طلاق دینے سے باز رہے۔ ہمیشہ یہی کہا جاتا کہ مرد کا پلہ بھاری ہوتا ہے اس لئے عورت کا خاندان اس کے سامنے گرگڑاتا ہے۔ اگر عورت کی نابالغ اولاد بھی ہے تو معاملات زیادہ پیچیدہ ہو جاتے ہیں ۔ شادی کے وقت عورت کو یہی تلقین کی جاتی تھی کہ اس نے خاوند کے گھر سے واپس نہیں آنا چاہے کچھ ہو جائے۔

اب زمانہ بدل چکا ہے۔ پہلے طلاق کو ہر اعتبار سے معیوب سمجھا جاتا تھا 'اب یہ زندگی کی معمولات کا حصہ بن چکی ہے۔ یہ بات اس حد تک درست ہے کہ شادی ایک معاہدہ ہے اور یہ عام طور پر کسی جذباتی وابستگی کے بغیر کیا جاتا ہے۔ شادی کسی خاص عورت سے نہیں کی جاتی' یہ کسی عورت سے کی جا سکتی ہے' کسی بھی عورت سے اولاد پیدا کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس عمل میں کوئی خاص جذباتی پہلو نہیں ہوتا جس کے تحت بیوی کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ تاہم ایک بات کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ دیر یا زیادہ دیر ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے مانوسیت کا عنصر پیدا ہو جاتا

ہے جسے عورت اپنے تحفظ کے لئے مبالغہ آمیز انداز میں محبت اور جانثاری کا نام دیتی ہے۔ کیونکہ خاوند پہلا شخص ہوتا ہے جس سے وہ جنسی فعل کرتی ہے اس لئے وہ مرد کی نسبت شادی سے زیادہ وابستہ ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ وہ شادی کو اپنے مستقبل کے نقطہ نظر سے دیکھتی ہے جبکہ مرد اسے کسی اور پہلو سے دیکھتا ہے اس لئے ایک دوسرے کے perception میں یگانگت یا مماثلت نہیں ہوتی۔ گھریلو عورت کا ملجا و ماوی گھر کی کائنات ہوتی ہے جسے وہ چھوڑنا نہیں چاہتی۔ زندگی کے معاملات میں انسانی مزاج' انا' ضرورت اور بہت سے ایسے عناصر ہوتے ہیں جو معمول کی زندگی میں در آتے ہیں۔ عورت طبعاً بعض معاملات میں intolerant ہوتی ہے وہ شوہر کے خاندان کو پسند نہیں کرتی' اس سے دور رہنا چاہتی ہے کیونکہ وہ کسی قسم کی مداخلت نہیں چاہتی' وہ خاوند کا مکمل قبضہ چاہتی ہے جو مرد کی آزادی پر ایک قدغن ہوتی ہے جسے مرد برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر وہ دیر سے گھر آتا ہے تو بیوی ہمیشہ یہی تصور کرتی ہے کہ وہ کسی عورت کے ساتھ تھا۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں اور شبہات بتدریج خانگی زندگی میں دراڑیں ڈالنا شروع کر دیتی ہیں۔ مرد اپنی خارجی زندگی میں بیوی کی مداخلت نہیں چاہتا' اسی طرح عورت چاہتی ہے کہ وہ اس کی گھریلو مملکت میں دخل اندازی نہ کرے۔ دونوں طرف سے یہ رویے دو متحارب فریقوں سے مماثل ہوتے ہیں۔ دونوں اپنا ماضی نہیں بھول سکتے۔ ماضی میں خاندان کی پرورش اور شخصی عادات بھی شامل ہوتی ہیں جن میں ہم آہنگی پیدا کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ تمامتر قرب کے باوجود دونوں میں مغائرت کا احساس رہتا ہے جسے دور کرنے کے لئے اولاد پیدا کی جاتی ہے۔ اولاد میاں اور بیوی کے رشتے کا ایک بندھن ہوتا ہے جو فریقین کو اکٹھے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ شادی در اصل ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا نام ہے۔ پاکستانی معاشرے کے متوسط طبقے کے گھرانوں میں جہاں بیوی اپنے آپ کو صرف گھر کے کام کاج تک محدود رکھتی ہے وہ ہر بات کے لئے خاوند کی محتاج ہوتی ہے۔ وہ اپنی

خواہشیں بھی جزوی طور پر پوری کر سکتی ہے' چنانچہ اسے خاوند کی بہت سے ناپسندیدہ حرکتیں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ وہ اپنا حق ضرور اپنے رویے کے ذریعے جتاتی ہے اور بار بار اعلان بھی کرتی ہے کہ وہ بیوی ہے اور اس کے حقوق ہیں دراصل وہ اپنے بدن کی اجرت مانگ رہی ہوتی ہے جسے اس نے عمر بھر کے لئے ایک مرد کے لئے وقف کیا ہوتا ہے۔ امتداد عمر کے ساتھ عورت کا مزاج مرد کی نسبت جلدی بگڑنے لگتا ہے' اس کی سب سے پہلی وجہ اس کے جسم کا انحطاط ہوتا ہے جسے وہ برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ اسے پیہم یہ خدشہ ہوتا ہے کہ اس کا شوہر کسی اور عورت کی طرف کھسک جائے گا۔ اس صورتحال سے نپٹنے کی بجائے بیوی جھگڑالو اور منتقم مزاج بنتی جاتی ہے' طویل گرہستی کا کام کاج' بار بار اولاد پیدا کرنے اور گھر کی اقتصادی حالت کی وجہ سے وہ مصالحت کرنے کی بجائے ایک مدافعانہ رویہ اختیار کرلیتی ہے۔

طلاق ایک صورتحال ہے اور ہر صورتحال کے محرکات ہوتے ہیں جو فرد کو فیصلے پر مجبور کرتے ہیں' اس لئے خاوند اور بیوی کے حوالے سے طلاق بھی اہم وجودی انتخاب Existential choice ہے جو زندگی کا چلن اور مستقبل بدل دیتا ہے۔ یہ مانوسیت' رفاقت اور ایک ہی چھت کے نیچے شب و روز بسر کرنے کے تسلسل کو ختم کر دیتی ہے۔ طلاق زندگی پر جراحی کرنے کے متراف ہے جس سے محبت کا ملمع اتر جاتا ہے اور نیچے وہی اجنبیت جھانکتی ہے جو شادی سے پہلے ہوتی ہے۔

طلاق کے محرکات ایک سے نہیں ہوتے۔ جو شادیاں چند ایک دنوں یا ہفتوں میں ٹوٹ جاتی ہیں ان میں عام طور پر مرد کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ میرج بیوروز سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس نوع کی شادیوں کے ٹوٹنے کی وجہ عام طور پر مرد کی نامردی بتائی جاتی ہے' اگر ان تمام بیوروز کی معلومات کو یکجا کیا جائے تو اس کے مطابق پاکستان میں مردوں کی نصف آبادی جنسی طور پر اپاج ہے

اس کے بر عکس یہاں جس سرعت اور تعداد میں تولید ہو رہی ہے وہ حیران کن ہے۔ طلاق کی دوسری وجہ دوسری شادی بتائی جاتی ہے۔ ۷۰ ' اور ۸۰ کی دہائیوں میں پاکستانی خاندان لڑکیوں کی شادی بیرون ملک پاکستانیوں سے کرنے کو ترجیح دیتے تھے 'اس کی وجہ دولت کی ریل پیل تھی لیکن امتداد وقت سے منکشف ہونے لگا کہ اس میں دھوکہ اور جھوٹ کا عنصر زیادہ تھا' جن کی شادی انجنیر کہہ کر کی جاتی وہ بیرون ملک مستری نکلتے جہاں انہوں نے پہلے ہی شادی کی ہوتی ۔ ۹۰ کی دہائی میں اور آجکل بھی لوگ لڑکیوں کی شادی بیرون ملک کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ تقلیب اپنے طور پر پاکستانی معاشرے کی اندرونی حالت سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ طلاق ایک فیصلہ ہے لیکن بہت سے ایسے خاندان ہیں جو اپنی عزت یا اولاد کے مستقبل کی وجہ سے سے خانگی ناراضگی یا ناپسندیدگی کے باوجود اکٹھے رہنے پر مجبور ہوتے ہیں' وہ ایک فیصلے اور اس کے مضمرات سے بچنے کے لئے ایک اور جہنم میں رہنا قبول کرتے ہیں۔

طلاق اس لئے بھی ایک تکلیف دہ عمل ہے کہ ایک عورت ایک نئے گھر میں نئی تمناؤں کے ساتھ ایک اچھے مستقبل کا خواب لے کر آتی ہے جو بوجوہ ٹوٹ جاتا ہے اور اسے واپس اسی گھر میں جانا پڑتا ہے جہاں سے اسے دھکیل کر باہر بھیجا گیا ہوتا ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسے خاندان ہیں جو عورت کی گھر واپسی کو کھلے دل سے قبول کرتے ہیں۔ عورت اور اس کی اولاد کو ایک ناپسندیدہ ذمہ اری تصور کرتے ہیں ہے۔ شادی کے ساتھ ہی ایک عورت ہونے کے ناطے اس کی قدو قیمت کم ہو جاتی ہے۔ وہ مردوں کی نگاہوں کا مرکز نہیں رہتی۔ پاکستانی معاشرے میں کسی عورت کا اولاد کے ساتھ دوبارہ شادی کرنے کا امکان صفر کے برابر ہے۔ یہ مرد کی نفسیات ہے کہ وہ دوسرے مرد کی اولاد کو قبول نہیں کرتا لیکن جب اس کی اپنی اولاد ہو تو وہ دوسری عورت کو اسے قبول کرنے پر اصرار کرتا ہے' اپنی دولت کی چمک دکھاتا ہے طرح طرح کی سہولتوں کے وعدے کرتا ہے۔ وہ حتیٰ الامکان مطلقہ یا بیوہ کی بجائے کنواری عورت سے شادی کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ ایک

شوہر کے ساتھ کچھ دیر یا کافی دیر رہ کر وہ ایک آدمی کی عادی ہو جاتی ہے اور اسے دوسرے مرد کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ نہ جانے یہ مردوں کے بہانے ہیں یا امر واقعہ ہے۔ بہت سی ایسی عورتیں بھی ہیں جو مجبوری کے تحت زندہ رہنے کے لئے فنکشنل سطح پر شادی کرلیتی ہیں کہ ان کی ضروریات پوری ہوتی رہیں اور انہیں خاوند یا گرہستی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کیونکہ یہ ضرورت کی شادی ہوتی ہے' ایسی عورتیں ایک خطرہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنے جسم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتیں۔

بہت کم ایسے خاندان ہیں جو طلاق کے معاملات کو خوش اسلوبی یا پر امن طریقے سے طے کرتے ہوں کیونکہ ایک شادی شدہ عورت کا بے گھر ہونا اور کسی مالی سہارے کے بغیر ایک دو بچوں کے ساتھ زندہ رہنا انسانی زندگی کا دردناک پہلو ہے۔ جھگڑا' فساد' خرچہ ' ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے اور ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ مال و دولت کھینچنے کی رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے سے محبت کے دعوے کرنے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ broken family کے بچے غیر معمولی نفسیاتی الجھنوں اور مالی بدحالی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے پاکستانی معاشرے میں خلع کی تعدا بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ بالعموم خلع کا تحرک خواندہ طبقے اور کریئروومن کی جانب سے ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی بھی قابل غور ہے' یہ مرد کے غلبے domination کے خلاف ایک بغاوت ہے۔ عورت یہ جانتی ہے کہ خلع میں اسے اپنا حق مہر اور بعض دوسری مراعتوں سے دستبردار ہونا پڑے گا اس کے باوجود وہ مصالحت سے انکار کرتے ہوئے اپنی آزادی کا اعلان کرتی ہے' ہر آزادی میں ایک دکھ بھی ہوتا ہے جسے وہ برداشت کرتی ہے۔ عورت کی معیشی آزادی سے اس کا مرد پر کم سے کم انحصار ہوتا جا رہا ہے اس لئے وہ نہ صرف اپنے حقوق کا اعلان کرتی ہے بلکہ ان کے حصول میں جد و جہد کر رہی ہے۔ عورت اور مرد دو مخالف جنسیں ہیں جن میں تصادم ہے اور رہے گا۔ طلاق تو اس کا ایک مظہر ہے۔

خواہش، خواب اور رات

خواہش' خواب اور رات ایک ہی دھاگے میں پروئی ہوئی حالتیں ہیں۔ اور ان تینوں کا تعلق جنسی خواہش اور وجود سے ہے'۔ وجود زماں و مکاں میں اپنے موجودگی یا ہونے کا احساس ہے کہ میرا وجود ان تمام سے الگ ہے' اگر میں نہیں تو میرے لئے کچھ نہیں ہے۔ اس احساس کو شعور کا نام دیا جاتا ہے جسے I amness بھی کہتے ہیں۔ وجود کو دوسروں کے ذریعے محسوس کیا جاتا ہے بلکہ حاصل کیا جاتا ہے' دوسرے ایک مخالف دنیا ہے۔ فرد عمر بھر ایک مخالفhostile دنیا میں رہتا ہے۔ وجود کو خواہشوں کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے جو اس کے ارادے کی وضاحت کرتی ہیں۔ خواہش کو زندگی سے منہا کر دیا جائے تو رہبانیت باقی رہ جاتی ہے جو اپنی نوعیت کی خودکشی ہے۔خواہش ارادے کو جنم دیتی ہے اور ارادہ اس کے حصول کا سفر ہے۔ جب خواہشیں پوری نہیں ہوتیں تو وہ خواب بننے لگتی ہیں' اور خواب صرف رات کو آتے ہیں۔ شروع میں رات کو بھی ایک حالت کہا گیا ہے۔بظاہر تو یہ ایک جغرافیائی حالت ہے۔ دن روشنی ہے جس میں چیزیں اپنے اصلی روپ میں نظر آتی ہیں۔ رات کو ان چیزوں کا ایک دوسرا روپ دکھائی دینے لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دن کام کے لئے اور رات آرام کے لئے بنی ہے۔ یہ بات پرانی ہو گئی ہے=رات ایک کارگاہ ہے جس کے کاموں کی نوعیت دن کے کاموں سے مختلف ہے۔دن کے وقت ذہن اور بدن دونوں کام کرتے ہیں' رات کو ذہن

زیادہ متحرک ہوتا ہے۔ رات ایک لفاف ہے جس میں عارضی طور کائنات چھپ جاتی ہے اور اس تیرگی میں انسان کا ذہن اور اس کی حسیات بہت تیز ہو جاتی ہیں۔ رات کو انسان دنیا کے کاموں سے پیچھے ہٹ کر اپنے من کی دنیا میں چلا جاتا ہے طرح طرح کے منصوبے بناتا ہے' سازشوں کے جال تیار کرتا ہے اور جو کچھ اسے کل کرنا ہوتا ہے اس کے بارے میں سوچتا ہے۔ رات وجود کو بیدار رکھتی ہے۔ نہ جانے کیوں رات کے وقت لاشعور کا ڈھکنا کھل جاتا ہے' کوئی مے ناب سے یہ ڈھکنا کھولتا ہے اور کوئی عورت کے بدن سے۔ یوں لگتا ہے کہ رات کی تیرگی میں شعور کی گرفت کمزور ہو جاتی ہے اور انسان کا غیر عقلی حصہ (irrational self) غالب آنے لگتا ہے۔ اگر ذہن میں کوئی منصوبہ نہیں ہوتا تو پھر جنسی خواہش کسمسانے لگتی ہے۔ جو اس خواہش کو پورا نہیں کر سکتے وہ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے نیند میں چلے جاتے ہیں اور وہاں سے خواب کی دنیا میں نکل جاتے ہیں۔

لیکن خواب کسے کہتے ہیں؟ خواب کی کوئی جامع تعریف موجود نہیں ہے چلئے یہ تصور کر لیتے ہیں کہ جو باتیں' یادیں اور تصویریں گہری نیند کے دوران نظر آئیں انیں خواب کہہ لیتے ہیں۔ خواب کبھی جامد نہیں ہوتے' تصویریں اور یادیں ہمیشہ متحرک ہوتی ہیں۔ خواب غیر اضطراری ہوتے ہیں انہیں حسب منشا طلب نہیں کیا جا سکتا۔ خوابوں کے لئے سونا ایک لازمی شرط ہے وگرنہ اس میں فینٹسی اور Day dreaming کی بحث در آتی ہے۔ خوابوں کی اصل ماہیت جاننے سے پہلے ان کی تاریخ جاننی بھی ضروری ہے کیونکہ خواب تو ہر زمانے میں دیکھے جاتے تھے اور اس بات کی سند تمام الہامی کتابیں ہیں جن میں خوابوں کا ذکر ہے۔ پرانے زمانے میں لوگ زیادہ خواب دیکھا کرتے تھے کیونکہ انسانی زندگی اتنی مصروف نہیں تھی اور زندگی کی گتھیاں سلجھانے اور کائنات کے نظام کو سمجھنے کے لئے رہنمائی کی ضرورت تھی۔ پرانے زمانے میں خواب انسان کی عملی اور روحانی زندگی کے لئے

اہم تھے۔ خواب انسان کے باطن کی آواز تصور کئے جاتے تھے جو انسان کو بہت سی باتوں کی پیشگی اطلاع دیتے تھے ۔ خوابوں کی اہمیت کے پیش نظر عالموں نے علم الرؤیا بھی ایجاد کیا تھا جو خوابوں کی تعبیر بیان کرتے تھے۔ چنانچہ خوابوں میں ظاہر ہونے والی علامتوں اور تصویروں کے معانی مقرر کر کے ان کا اطلاق زندگی کے مختلف واقعات پر کیا جاتا تھا۔۔

انیسویں صدی کے آخر میں سگمنڈ فرائیڈ نے نفس انسانی کا مطالعہ کرتے ہوئے خوابوں کو انسانی لاشعور کا حصہ کہا ہے۔ خوابوں کی تشریح میں کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ نیند کے دوران نظر آئے اسے خواب کہا جا سکتا ہے۔ یہ تشریح نامکمل ہے کیونکہ ہر مکمل خواب کا اپنا ایک سٹرکچر ہوتا ہے۔ بعض دفعہ نیند میں صرف ادھوری تصویریں نظر آتی ہیں جنہیں خواب نہیں کہا جا سکتا۔ نیند میں شعور کا بہت سا حصہ خاموش ہوتا ہے اس کے باوجود کسی نہ کسی سطح پر کوئی نہ کوئی شعور مصروف کار رہتا ہے۔ خواب غیر اضطراری ہوتے ہیں انہیں مرضی کے مطابق طلب نہیں کیا جا سکتا۔ اس بارے میں ایک مشاہدہ یہ بھی ہے کہ لڑکپن اور جوانی میں خوابوں کی کثرت ہوتی ہے۔ لڑکپن کے خواب عموماً جنسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں چونکہ جنسی اظہار ممنوعہ ہے اس لئے یہ خواہش خوابوں میں مختلف شکلوں میں اپنا اظہار کرتی ہے۔۔ عجیب بات ہے کہ جنسی خواب دیکھنے کے فوراً بعد جنسی لذت کے حقیقی ارتسامات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ جنس ہی نہیں شدید خوف کی حالت میں بیدار ہونے پر دل کی تیز دھڑکن یا پسینے میں شرابور ہونا اس بات کا غماض ہے کہ خواب جس دنیا سے ہی اپنا آب و دانہ حاصل کرتے ہیں وہ عارضی طور پر نیند کی حالت میں خواب دیکھنے والے کی ذہنی حالت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس عمل کی تحلیل نفسی بہت مشکل ہے۔ فرائیڈ نے تو بڑے سیدھے سادھے طریقے سے کہہ دیا ہے کہ انسان کی نامطمئن خواہشیں، خوابوں کے روپ میں نمودار ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق فرد کے لاشعور سے ہے جو اس کی شخصیت کی زمام تھامے

ہوئے ہے۔ خواب میں تمنائیں شکلیں اور چیزیں اپنے اصلی یا بگڑے ہوئے حلیے میں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ غیب کی علامتیں نہیں ہوتی ہیں نہ اچھے یا برے مستقبل کا شگون۔ یہ بحث کرتے ہوئے فرائیڈ از منہ رفتہ اور قدیم انسان کا ذکر کرتا ہے کہ اس کا تصور خواب اس کے کائنات کے تصور سے منسلک تھا اس لئے وہ خوابوں سے رہ نمائی حاصل کرتا تھا۔ سوفو کلیز کے ڈرامے ہوں یا شکسپیئر کا ہیملٹ یا میکبتھ وہ خوابوں کی دنیا کو اصل دنیا میں لے آتے ہیں۔ توریت میں اور پھر قرآن مجید میں بھی خوابوں کا ذکر ہے۔ دونوں مقدس کتابوں میں فرعون کے خواب کا ذکر ہے جس کی تعبیر حضرت یوسف نے بتائی تھی جو خوابوں کی تعبیریں بیان کرنے کے لئے بہت مشہور تھے۔ فرائیڈ اور ایڈیلر خوابوں میں موجود الہامی عناصر یا ان میں پیش گوئی کے امکانات کو رد کر کے انہیں ذہن انسانی کا عمل کہتے ہیں ۔ ان کا تعلق انسان کی خواہشوں یا اس کے دبے ہوئے میلانات اور ہیجانات سے ہے جنہیں معاشرتی رکاوٹیں ظاہر ہونے کا موقع نہیں دیتیں۔ ان دو مفکرین کی نسبت یونگ نے زیادہ تفصیل کے ساتھ خوابوں کے مسئلے پر غور کیا ہے اور اسے ایک انفرادی ذہنی عمل تک محدود رکھنے کی بجائے اس کے رشتے قدیم انسانوں سے جا ملائے ہیں۔ یونگ خواب دیکھنے کو علامتی عمل سے تعبیر کرتا ہے جو کچھ ہم خوابوں میں دیکھتے ہیں ان کا تعلق ہمارے لاشعور اور ایک حد تک قدیم ماضی سے ہوتا ہے۔ خواب بذات خود ایک زبان کا درجہ رکھتے ہیں۔ خواب سوچے نہیں" دیکھے جاتے ہیں۔ دیکھنا ہی ہمارے وقوف کا بنیادی راستہ ہے۔ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اس کا بہت سا حصہ ہمارے علم کے بغیر ہی ہمارے ذہن کی مختلف پرتوں میں اترتا جاتا ہے۔ فرد کے اندر اتنا کچھ موجود ہوتا ہے کہ اسے خود اس بارے میں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔

شاعروں اور مصوروں نے اپنی تخلیقات میں خوابوں کے عناصر شامل کر کے supera-reality کا تصور پیش کیا ہے۔ بعض فنکار تو تلازمے کی آزاد رو کی مدد سے یا منشیات کے استعمال سے لاشعور کا ڈھکنا کسی حد تک کھول لیتے ہیں اور

انہیں جو کچھ ملتا ہے اسے اپنے فن میں استعمال کرتے ہیں۔ ادب میں خواب کو ایک دفاعی نظام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ برے حالات میں فنکار اپنے خوابوں میں چھپ جاتا ہے۔ یونگ کے خیال میں ہر شعوری فعل کے ساتھ اس کا لاشعور بھی موجود ہوتا ہے۔ شعور اور لاشعور ایک ہی رشتے میں بندھے ہوتے ہیں۔ جو باتیں' تصویریں اور یادیں شعور کی حالت کو نہیں پہنچتیں وہ اپنا آپ خوابوں کی دنیا میں دکھاتی ہیں۔ خواب اضطراب کا نتیجہ ہوتے ہیں جو اندر کے پیغامات کو فرد تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ یونگ لکھتا ہے کہ خوابوں کے ذریعے ہماری جذباتی حالتوں میں توازن بھی پیدا ہوتا ہے' خواب دیکھنے کے بعد ہم اپنے بارے میں اور جو کچھ ہم نے دیکھا ہوتا ہے غور و خوض کرتے ہیں۔ جہاں تک خوابوں کی تعبیر کا تعلق ہے ان میں نیم صداقت ہوتی ہے۔ ان کا خمیر انسان کے باطن سے اٹھتا ہے جس میں اس کی یادیں' خوف' خدشات اور توقعات' دوستیوں اور دشمنوں کے نقوش پنہاں ہوتے ہیں' ہم زندگی میں جن کرائسس میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے بارے میں ہمارا ردعمل جب خواب میں نمودار ہوتا ہے جو بعض اوقات اتفاقی طور پر عملی دنیا میں درست ثابت ہوتا ہے۔ آج کے زمانے میں' جب ہمارا ذہن ہر بات میں منطق دریافت کرتا ہے' خوابوں سے رہنمائی حاصل کرنا ایک غیر عقلی سی بات ہے۔

خوابوں کا تعلق صرف فرد کی ذات ہی سے نہیں ہے ان کی تشکیل میں معاشرتی قوتیں بھی شریک ہوتی ہیں جو اس کے خوابوں کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ وہ معاشرے جو گھٹن کا شکار ہوں' اور غیر عقلی باتوں پر اعتقاد رکھتے ہوں' ان کے لئے خواب خصوصی اہمیت رکھتے ہیں' بالکل اسی طرح جیسے دست شناسی سے انسان کے مستقبل کے بارے میں قیافے لگائے جاتے ہیں۔

جس معاشرتی اور سیاسی آب وہوا میں پاکستانی سائیکی نے پرورش پائی ہے اس میں خواب ہمارے لاشعور کی دنیا تک رسائی میں بہت معاون ہیں۔ کیونکہ ہمارا معاشرہ غیر مطمئن ذہنوں' ادھوری خواہشوں اور رسوم کی مجبوریوں اور ایک

دوسرے سے خوف کا معاشرہ ہے جو جوں کی توں صورت حال میں اپنی سلامتی محسوس کرتا ہے۔ ہماری آبادی کا بیشتر حصہ کام کاج کے بغیر ہے فرصت اور بے مقصدی خوابوں کے لئے بہت زرخیز ہوتی ہے۔ اس بے مقصدی میں جنسی خواہش بھی زور پکڑتی ہے، کبھی خوابوں میں اور خیالوں میں، کبھی کسی پسندیدہ عورت کا چہرہ ابھرتا ہے اور کبھی خیالی عورت وضع کی جاتی ہے کبھی اس سے محبت کی جاتی ہے اور کبھی ہمبستری ۔ یہ سارا عمل day dreaming یا رات کو خوابوں کی گود میں ہوتا ہے۔ فرد کی جنسی زندگی کا بہت سا حصہ اس کی سوچ یا احساس میں مقیم رہتا ہے جو بتدریج اس کے خوابوں کا موضوع بن جاتا ہے۔ ہمیں فرائیڈ کی بات ماننا پڑتی ہے کہ خواب انسانی زندگی کو ایک ریلیف مہیا کرتے ہیں۔ خوابوں میں اپنے جوہر مدعا کو تو نہیں پایا جا سکتا تاہم اس کا لمس محسوس کیا جا سکتا۔ حالانکہ آپ کا جسم کسی کام کاج میں متحرک نہیں ہوتا۔ ان مثالوں سے کم سے کم یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خواب دیکھنے کے عمل کا تعلق فرد کے اعصابی نظام سے براہ راست ہوتا ہے۔ جب اس کے شعور کی گرفت کمزور ہوتی ہے تو اس کے اندر سے بہت کچھ نکلتا ہے جو اس کے لاشعور کی حالت کا پتہ دیتا ہے۔ یہ عمل عام طور پر رات کو شروع ہوتا ہے جب فرد جذباتی طور پر دن کی نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اکثر لوگ سونے سے پہلے مطالعہ کرتے ہیں، اپنے آپ کو تھکاتے ہیں اور ایک حد تک اپنے اندر سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خوابوں کی یورش سے نہیں بچ سکتے۔ خواب بھی انسانی زندگی کا حصہ ہیں جنہیں وہم سمجھ کر رد کرنا نہیں چاہئے۔ انسان کا باطن اس کے ظاہر سے زیادہ بڑا ہوتا ہے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ماہرین نفسیات طرح طرح کے طریقے استعمال کرتے ہیں۔ خواب فرد کے باطنی انکشاف کا ایک معتبر ذریعہ ہے اور اس کی تعبیر میں بعض مسئلوں کا حل بھی مضمر ہے۔

طوائف کی اندھی گلی

جنس پر گفتگو کرتے ہوئے جسم فروشی کے کاروبار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس پیشے کو دنیا کا سب سے قدیم پیشہ کہا جاتا ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کسی نے اس پیشے کی بیحد مذمت کی ہے اور کسی نے طوائف کو تمام اخلاقی برائیوں کی جڑ کہا ہے۔ ہر معاشرے میں جسم فروشی کو ایک مذموم کاروبار تصور کیا جاتا ہے۔ اس پیشے کو روکنے کے لئے قوانین بھی بنائے گئے ہیں' بعض نظریاتی ریاستوں نے اس پیشے کے خلاف شدید سے شدید اقدام بھی لئے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ابھی تک طے نہیں ہو سکا کہ مرد نے عورت کو جسم فروشی کے پیشے پر مجبور کیا تھا یا اس میں عورت کا ایما بھی شامل تھا! اس تحقیق سے کچھ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ اس سے عورت یا طوائف کا مقدر نہیں بدل سکتا۔ تاہم یہ وثوق سے کہا جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی عورت ارادی طور پر اس پیشے میں آتی ہو' سوائے ان عورتوں کے جو پیشہ ور طوائف کے گھر پیدا ہوتی ہیں یا رد عمل کے طور پر اس پیشے میں شامل ہو جاتی ہیں۔ طوائف بننے کی بہت سی کہانیاں ہیں جن میں گھروں سے بھاگی ہوئی لڑکیاں' گھریلو ملازمائیں'، جنسی طور پر نامطمئن عورتیں' نمفومینیکس اس پیشے میں مرضی سے یا زبردستی در آتی ہیں۔ عجب اتفاق ہے کہ ہر معاشرہ طوائف کے پیشے کو ممنوع قرار دیتے ہوئے بھی اسے بند نہیں کرا سکتا۔ اس کی وجہ یہی بیان کی جاتی ہے کہ معاشرے نے لوگوں کی جنسی خواہشات کے انعکاس کے لئے ایک چور دروازہ دانستہ طور پر کھلا رکھا ہوا ہے اگر اسے بند کر دیا گیا تو معاشرے میں

بہت سی خرابیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ طوائف کا پیشہ شروع ہی سے بین الاقوامی سطح پر چلتا رہا ہے۔ ایک ملک کی عورتوں کو دوسرے ملک میں اسی کام کے لئے فروخت کیا جاتا ہے۔ طوائف کے پیشے کو سب سے زیادہ فروغ بادشاہوں' امراء حکمرانوں اور صاحب ثروت لوگوں نے دیا ہے۔ مرد کی نفسیات بھی بعض حالتوں میں نا قابل فہم ہوتی ہے۔ مرد خواہ کسی ملک سے ہو وہ عورت کے معاملے میں ہمیشہ دوسرے ملکوں کی عورتوں کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ جنگوں کے بعد فاتح سپاہی سب سے پہلے عورتوں کو اٹھاتے ہیں۔ آجکل بھی جب لوگ دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو وہ سب سے پہلے اس ملک کی عورت کو دریافت کرنا چاہتے ہیں ۔ سر تھامس رو اپنے سفرنامہ ہند میں لکھتا ہے کہ جہانگیر کے حرم میں نہ صرف یوروپین بلکہ ہر ملک کی عورتیں موجود تھیں' ظاہر ہے وہ پیشہ ور عورتیں تھیں۔

طوائف کی بہت سی تشریحیں کی گئی ہیں لیکن تمام تشریحوں میں جو قدر مشترک ہے وہ جسم کی جنسی عمل کے لئے عارضی فروخت ہے۔ طوائف اپنی معیشت مرد کو اپنے جسم کے استعمال کا حق دے کر کماتی ہے۔ مغربی معاشروں میں جہاں جنسی آزادی بھی ہے اور مرد اور عورت کے میل جول پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے وہاں جسم فروشی کا فن عروج پر ہے جس سے کم سے کم یہ عیاں ہوتا ہے کہ طوائف کا پیشہ اگر ایک طرف معاشرے کے کسی ایک طبقے کو جنسی اطمینان پہنچاتا ہے تو دوسری طرف یہ مرد کی بعض جنسی کجیوں sexual perversions کو بھی تحریک دیتا ہے۔ طوائف مرد کی جنسی خواہش کو exploit کرتی ہے۔ چنانچہ جنسی عمل کی آمادگی میں اس کے ذہن میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ وہ ایک رات یا دن میں کئی مردوں کے ساتھ جنسی عمل کرتی ہے کیونکہ اس کی معیشت کا واحد ذریعہ ہے یا وہ مربی جو اسے اس پیشے پر بٹھاتے ہیں انہیں جلدی زیادہ سے زیادہ پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں کی معاشرتی تاریخ میں طوائفوں کے کئی روپ اور رول

رہے ہیں۔ مغلوں کے زمانے میں دو طرح کی طوائفیں تھیں' ایک گانے بجانے والیاں جو امراء کی اولادوں کو نام نہاد معاشرتی آداب سکھاتی تھیں' دوسری قسم کی طوائفیں جسم کا دھندا کرتی تھیں۔ عام عورتوں کی موجودگی کے باوجود طوائف کی طرف رجوع کرنا بھی اپنے طور پر ایک استفسار ہے کہ کس قسم کے لوگ طوائفوں کی طرف رجوع کرتے ہیں؟ رومانٹک 'نفسیاتی طور پر کھسکے ہوئے' شاعر اور ادیب' تنہائی کا شکار اور زندگی سے محروم لوگ ؟کیا طوائف ان لوگوں کے ایک شیلٹر ہے یا وہ اس سے کسی قسم کا ڈائیلاگ کر سکتے ہیں۔ یہاں کی طوائف پیسے کے علاوہ کسی قسم کا ڈائیلاگ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کیونکہ طوائف کی صورتحال میں نا امیدی ہے ' اپنی ذات کا انکار ہے اپنے احساسات کا انکار ہے۔ اسے اپنے پیشے کی مجبوری کے تحت آمادگی اور پسندیدگی کا سوانگ رچانا ہے جو کچھ وہ کر رہی ہوتی ہے وہ خود نہیں کرتی بلکہ اپنے سے ماورا طاقتوں کا حکم بجا لا رہی ہوتی ہے۔ اس لئے طوائف کی حیثیت ایک پتلی کی ہوتی ہے۔ طوائف بذات خود خوف کا شکار رہتی ہے۔ اس کے اندر گناہ کا خوف بظاہر موجود نہیں ہوتا تاہم وہ مذہبی تہواروں اور دوسری رسوم کی پابندی کے ذریعے کفارہ ادا کرتی رہتی ہیں۔ بہت سی پیشہ ور طوائفیں محرم اور رمضان کے مہینوں میں گریز کرتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں تو وہ آخری عمر میں حج کا فریضہ ادا کرکے کفارہ ادا کرلیتی تھیں۔ لیکن آج کی صورتحال مختلف ہے اور اس پیشے میں بھی بہت سی تبدیلیاں آگئی ہیں۔

امریکہ اور خاص طور پر فرانس میں جسم فروشی ایک بین الاقوامی صنعت بن چکی ہے جہاں بھانت بھانت کی عورتیں نائٹ کلبوں میں جسم کی نمائش اور جسم فروشی کے لئے موجود ہوتی ہیں۔ وہ اپنے جسم کے اور مباشرت کے ویڈیوز شوق سے بنوا کر بین الاقوامی منڈیوں میں فروخت کرتی ہیں۔ ہر مغربی ملک کے سیکس چینلز ہیں جو آدھی رات کے بعد حرکت میں آتے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں کے رہائشی کمروں

میں گاہکوں کے لئے ٹیلیوزن رکھے ہوتے ہیں جن میں سکے ڈالتے جائیں اور مناظر دیکھتے جائیں۔ فرانس کا ایک ٹیلیوزن چینل طوائفوں کے لئے مخصوص ہے جو اشتہار میں اپنی تصویر، گھر کا پتہ، جسم کی پیائش اور زیادہ سے زیادہ جنسی لذت دینے کا دعوی کرتی ہیں۔ اہل مغرب نے بغیر ناک بھوں چڑھائے طوائف کے کاروبار کو زندگی کی معمولات کا ایک حصہ تصور کر لیا ہے۔ ہمارے ہاں بھی دیکھا دیکھی کچھ تبدیلیاں آئی ہیں۔پڑھی لکھی اور سمجھ دار طوائفیں چکلوں کی بوسیدہ اور غیر انسانی فضا سے نکل کر شہروں کے اندر پھیل گئی ہیں۔ انہوں نے بھی کھاتے پیتے اور پڑھے لکھے طبقے کے طور طریقے اپنا لئے ہیں۔ انہوں نے ظاہرا طور پر طوائف اور عام عورت میں فرق مٹا دیا ہے جو اشراف کے لئے ایک پیغام بھی ہے۔ ان پیشہ ور عورتوں کے علاوہ بدترین اقتصادی حالات میں عام عورتوں نے بھی روپ بدلنا شروع کیا ہے۔ خواندہ خواتین جو مالی دباؤ کا شکار ہیں جدید اصطلاح میں اپنے لئے investors تلاش کر لیتی ہیں جو ان کی ضروریات پورا کرتے رہتے ہیں اور شرافت کے دائرے میں رہ کر کبھی کبھار ان کے جسم سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

بشریات کی تاریخ سے کم سے کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ جسم فروشی کا کاروبار مردوں نے شروع کیا تھا۔ عورتیں مجبور تھیں یا ان کی مالی کفالت کا مسئلہ درپیش تھا کہ پرانے زمانے میں غلاموں کی تجارت کے ساتھ عورتوں کو بھی فروخت کیا جاتا تھا۔ دوسری طرف طوائفوں کے حوالے سے فرائیڈ کے اصول لذت کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ مرد کی فطرت میں ہے کہ وہ کبھی ایک عورت سے مطمئن نہیں ہوتا اور لذت کے لئے دوسری عورتوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ طوائف کا پیشہ جسمانی لذت اور سکون بہم پہنچانا کا ذریعہ بنتا ہے عام عورتیں گرہستی کی تھکا دینے والی روٹین، اپنی وجاہت سے بے توجگی، اولاد کی بھرمار اور دیگر پریشانیوں کے باعث مرد کے لئے کشش کھو بیٹھتی ہیں، وہ اٹھتے بیٹھتے مطالبے کرتی ہیں، بات بات پر جھگڑتی

ہیں جس کے نتیجے کے طور پر مرد دوسری عورتوں یا طوائفوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جہاں سوائے پیسے کے کوئی مطالبہ نہیں ہوتا۔ کوئی ایسا بندھن نہیں ہوتا جو مجبوری بن جاتا ہو۔ ظاہر ہے کہ تمام لوگ طوائفوں کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ ایک خاص نوع اور مزاج کے لوگ ان کی طرف جاتے ہیں۔ جن میں پہلی نوع لذت جویان کی ہے جو ہر نئے بدن میں لذت کے متلاشی ہوتے ہیں لیکن وہ بھولتے ہیں کہ جس کی انہیں تلاش ہوتی ہے طوائف انہیں وہ کچھ دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ جسم کا یہ کھیل فریب ہوتا ہے۔ طوائفوں کی طرف وہ لوگ بھی جاتے ہیں جن کا کوئی جذباتی سہارا نہیں ہوتا' جو نسائی لمس اور رفاقت کے لئے ان کے پاس جاتے ہیں' وہ بھی اس فریب یا خوش فہمی کا شکار ہوتے کہ شہناز لالہ رخ ان کا اندمال کرے گی۔ وہ تنہائی سے عاجز آ کر ان کے پاس جاتے ہیں جو ان سے بھی زیادہ تنہا ہیں۔

طوائف کے لئے اور اس کے گاہکوں کے لئے اس کی زندگی میں گلیمر اور شوروشغب ہوتا ہے۔ شادیوں میں مجرے' کلبوں میں رقص' ذاتی محفلوں میں رقص' گانا بجانا' روپے پیسے کی بارش' لمبی لمبی کاروں میں سفر' وزیروں اور کبیروں کے خلوت کدوں میں جا کر لوگوں کے کام کروانا اپنے لئے طرح طرح کی مراعات حاصل کرنا اس کے روز و شب کا حصہ ہیں لیکن اس سارے ہنگاموں میں وہ چور آنکھوں سے وقت کی چاپ بھی سنتی ہے جو اس کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ جونہی اس کے چہرے پر ایک آدھ شکن نے بسیرا کیا وہ اس کھیل سے باہر ہو جاتی ہے۔ یہ اس کے المیے کا آغاز ہے۔ طوائف اپنے ماضی کو بھلا دیتی ہے اور مستقبل کی طرف نہیں دیکھتی' وہ صرف حال میں زندہ رہنا چاہتی ہے یہ نہ جانتے ہوئے کہ حال بھی پیہم حرکت میں رہتا ہے۔ ادھیڑ عمر اس کے پیشے کا انجام ہے۔ اسے باقی عمر کسی اولاد اور کسی گرہستی کے بغیر بسر کرنی ہے۔ گناہوں سے تائب ہونے سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہے کہ اس کی روح تو کب کی مر چکی ہوتی ہے۔ اس کے لئے اب یہی راستہ

رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے سہارے کے لئے نوجوان لڑکیوں کو طوائف بنائے۔

طوائف کو بہت سے غیر ملکی مصنفوں نے ناولوں اور افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور تمام کیapproach ایک سی ہے۔ منٹو کا افسانہ "ہتک" طوائف کے موضوع پر دنیا کا سب سے اچھا افسانہ ہے۔ موپساں کا طوائف پر شہرہ آفاق افسانہ "بولی دی سوئف" ہتک کے مقابلے میں یک سطحی افسانہ ہے۔ منٹو نے ہتک میں طوائف کی سائیکی کی مختلف سطحیں اور معاشرتی رد عمل کو مربوط کیا ہے۔ سوگندھی ہر صبح اپنے پیشے کا آغاز گنیش کی پوجا سے کرتی ہے ۲۔ وہ مجبوری کے تحت پیشہ کرتی ہے۔۳۔ وہ ہر آدمی کے ساتھ سونا نہیں چاہتی کیونکہ اسے بھی کراہت آتی ہے ۴۔ رام دلال اس کا ایجنٹ ہے جو اس کا مالی استحصال کرتا ہے۔۴۔ وہ گرہستی چاہتی ہے اور ایک غلیظ سے ہیڈ کانسٹبل کو بھی بطور شوہر قبول کرنے کے لئے تیار ہے لیکن وہ اس کے پیسے بٹور کر اس کی کمائی پر زندہ رہنا چاہتا ہے۔۵۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی اس سے محبت کرے لیکن اس سے محبت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔۶ سیٹھ اس کے چہرے مہرے کو ناپسند کر کے اس کی ہتک کرتا ہے' اس کے اندر کی عورت جاگ کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ وہ ہیڈ کانسٹبل کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیتی ہے۔ اور ایک خارش زدہ کتے کو انسان پر ترجیح دیتی ہے۔۔۔۔ "ہتک" dehumanization کا ایک بڑا افسانہ ہے جس میں ایک طوائف کا پورا المیہ موجود ہے' اس میں مذہب اور اخلاقی قدروں کا تضاد بھی موجود ہے' اس میں ایک استحصالی سرمایہ داری نظام اور اس میں پلنے فرد کی انا کو رد کرنے والے رویے بھی موجود ہیں۔ اس افسانے میں بنیادی پکار طوائف کو حق زیست دے کر اس کیdignity کو بطور انسان بحال کرنا ہے۔ ہر طوائف یہی چاہتی ہے۔ یہ افسانہ یہ بھی بتاتا ہے کہ غیر انسانی اور اسفل ماحول میں بھی انسانی جذبات محو نہیں ہوتے۔

ہر معاشرے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو فرط محبت میں طوائفوں سے شادی بھی کر لیتے ہیں، لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ایک گمراہ کی اصلاح کے لئے اسے بیوی بنا لیتے ہیں لیکن معاشرہ طوائف کے گناہ کو معاف نہیں کرتا، ماضی میں طوائف ہونے کا دھبہ اس کے ساتھ چلتا ہے۔ اس کی جائز اولاد کو بھی طوائف کی اولاد کہا جاتا ہے۔ معاشرہ طوائف کو بطور طوائف رہنے کی اجازت دیتا ہے لیکن اسے ایک عام عورت نہیں بننے دیتا۔ طوائف کے لئے توبہ کا کوئی در نہیں ہے۔ کسی کو اس میں دلچسپی نہیں ہوتی کہ وہ جن حالات میں پیشہ کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ بہت سی ایسی مثالیں بھی ہیں کہ طوائفیں شادی کرنے کے بعد پھر اپنے پیشے میں واپس آگئیں کیونکہ انہیں بطور بیوی کے قبول نہیں کیا گیا۔ طوائف بننا ایک سزا ہے جو معاشرہ یا عورت خود اپنے آپ کو دیتی ہے۔ یہ داخلیت سے محروم زندگی ہے جس میں کوئی Privacy نہیں ہے۔ یہ ایک جہنم ہے، ایک اندھی گلی ہے جس میں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

آبادی کا ایٹم بم

آبادی کے ایٹم بم کا براہ راست تعلق ازدواجی زندگی سے ہے۔ہم ہر سال ایک بچہ بنا کر مسرت سے تالیاں بجاتے ہیں کہ ہم نے ملک کی افرادی قوت میں اضافہ کیا ہے اور اپنے دست و بازو کو مضبوط بنا لیا ہے۔ جنسی اعتبار سے بھی پاکستانی عورت اتنی زرخیز اور مضبوط ہے کہ وہ پندرہ سے بیس بچے کسی طبی مدد کے بغیر بنا لیتی ہے۔ لیکن ہماری خوشی عارضی ہوتی ہے کیونکہ دور سے مستقبل غم کا دف بجا رہا ہوتا ہے۔ ہم خوشی کی حالت میں اسے سن نہیں پاتے۔ اولاد سب کو اچھی لگتی ہے جس کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی ہیں جو کم و بیش سب جانتے ہیں۔ الجزائر کی جنگ آزادی کے دوران بہت سے نوجوان شہید ہو گئے تھے اور اس کی آبادی بمشکل ایک کروڑ لوگوں پر مشتمل تھی، رقبے کے اعتبار سے یہ ملک پاکستان سے پانچ گنا بڑا ملک ہے۔افرادی قوت کی کمی پورا کرنے کے لئے بومدین کی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ ہر نومولود کے والدین کو پچاس دینار ماہوار اضافی دیئے جائیں گے۔اس کے بر عکس پاکستان حکومت کو ان لوگوں کو ماہوار مشاہرہ دینا چاہئے جو مزید اولاد نہ پیدا کرنے کا وعدہ کریں ۔اس وقت پاکستان کی آبادی چودہ پندرہ کروڑ کے قریب جا پہنچی ہے۔ پاکستان ایک چھوٹا ملک ہے جس کی زرعی زرخیزی پنجاب کے صوبہ تک محدود ہے۔ پنجاب پاکستان کا آبادی کے اعتبار سے سب سے گنجان صوبہ ہے۔

کیا ہمیں واقعی مزید آبادی کی ضرورت ہے؟ یہ مسئلہ پاکستان کی کسی حکومت

نے کبھی غور سے نہیں سوچا۔ شاید سوچا بھی ہو لیکن علما کے خوف سے انہوں نے فیملی پلاننگ کے ساتھ نیم دروں اور نیم بیروں کی پالیسی بنا رکھی ہے۔ فیملی پلاننگ کے دفاتر قائم کئے ہیں لیکن ان کی کارکردگی صفر ہے۔ وہ اخبار اور دوسرے میڈیا پر ضبط اولاد کے اشتہار دیتے ہوئے علما سے ڈرتے ہیں۔ ہماری سب حکومتیں ایک دوسرے کے خوف سے ہی قائم رہتی ہیں۔ مذہبی طبقے سے فیملی پلاننگ کے خلاف یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ احکام کے منافی ہے جو بچہ اس دنیا میں آتا ہے وہ اپنے دو ہاتھ اور اپنا رزق ساتھ لاتا ہے۔ اس کی دنیا میں آمد کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔ یہ مسئلہ متن کی تشریح کا ہے۔ اگر حکومت اور لوگ اس موقف کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر ہر شخص کو قومی مفاد کے لئے ضبط نفس سے کام لینا چاہئے کیونکہ قومی سطح پر کثرت آبادی نے بہت بڑے مسائل پیدا کئے ہیں اور مزید پیدا ہو رہے ہیں۔ بنگلہ دیش، بھارت اور سری لنکا میں بھی آبادی میں اضافے کی شرح غیر معمولی تھی لیکن حکومتی سطح پر پرچار نے ان ممالک میں آبادی کی شرح کافی کم ہو گئی ہے۔ جاپان پاکستان سے بھی زیادہ چھوٹا ملک ہے۔ اس کی آبادی بھی چودہ پندرہ کروڑ تک جا پہنچی تھی، عوام کے تعاون اور حکومت کی مناسب دیکھ بھال سے اب وہاں شرح آبادی منفی ہوتی جا رہی ہے۔ مغربی یورپ میں بھی شرح آبادی منفی ہے۔ افغانستان، ایران، ترکی رقبے کے اعتبار سے پاکستان سے دوگنے بڑے ملک ہیں لیکن وہاں کی آبادی پاکستان کے مقابلے میں چار پانچ کروڑ سے بھی کم ہے۔ ان ملکوں میں بھی شرح خواندگی اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے عوام سمجھ دار ہیں اور گاہے گاہے حکومتوں کی بات مان لیتے ہیں۔ پاکستان میں شروع ہی سے عوام اور حکومتوں میں مخاصمت کا رویہ رہا ہے۔ ایک دوسرے میں اعتماد کی کمی سے تمام خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ حکومتیں عوام سے لاتعلق رہی ہیں انہیں صرف موقعہ بموقعہ سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرتی رہی ہیں، کسی حکومت نے عوام کی تہذیب اور اعلیٰ انسانی اقدار کی تلقین نہیں کی اور نہ ہی ایسے معاشرتی ادارے بنائے جو انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری کی تربیت

دے سکیں۔ اس غفلت کے نتیجے میں ہمارے عوام کا ایک بے مہار لشکر جرار کسی قاعدے اور ضابطے کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے ' اس Vandalism میں خواندہ اور دونوں طبقے شامل ہیں۔ چنانچہ خود غرضی اور ناجائز ہماری اجتماعی سائیکی کا نشان امتیاز بن چکے ہیں۔ ہمارا سیاسی کلچر شرمناک ہے جسکا انسانی اقدار اور ملکی بہتری سے دور کا تعلق نہیں ہے۔ان حالات میں عوام اور حکومتیں دو متوازی راستوں پر چل رہی ہیں۔ عوام کے من میں جو آتا ہے وہ کر دیتے ہیں' اسی طرح جو حکومت کے اپنے مفاد میں ہوتا ہے اسے عمومی فلاح کے ملمع میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس صورتحال میں لوگ حکومتوں کی کب سنتے ہیں۔ حکومت کی بلا سے آبادی سو کروڑ ہو جائے' لوگوں کو اس سے کیا ہر ایک نے نو مہینوں کے بعد ایک بچہ بنانا ہے۔ نتیجہ: اس وقت دنیا میں شرح آبادی اور غربت میں پاکستان دوسرے یا تیسرے نمبر پر ہے۔

آبادی کے پھیلاؤ اور غربت میں علت و معلول کا ربط ہے۔ آبادی نہ صرف ملک کو کھا جاتی ہے بلکہ یہ شہروں کی جڑیں کھوکھلی کر کے ہر طرح کی انفرادیت کا حرف مٹا دیتی ہے بس انسانی سروں کا ایک ہجوم باقی رہ جاتا ہے۔

غیر معمولی آبادی کو ایک آفت کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ کس طرح انفرادی محن اور معاشرتی مصیبتیں پیدا کرتی ہے' اس کو سمجھنے کے لئے لاہور شہر کی مثال کو سامنے رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۷ میں لاہور شہر کی آبادی چھ لاکھ سے کچھ متجاوز تھی۔ اس وقت ۲۰۰۲ میں اس کی آبادی کوئی ۸۰ لاکھ نفوس کے قریب قریب آ چکی ہے۔ نصف صدی میں ۱۴ گنا آبادی کا اضافہ ہوا ہے اس سے قطع نظر کہ اس لشکر جرار نے یہاں جنم لیا ہے یا اس میں آباد کار بھی ہیں۔ آباد کار سے مراد وہ لوگ' امیر اور غریب دونوں' بہتر معیار زندگی یا حصول رزق کے لئے لاہور میں آ بسے ہیں۔۔ اس کا میکانیزم کچھ اس قسم کا ہے کہ پہلے دیہات سے ایک فرد آ کر طالع آزمائی کرتا ہے' مزدوری' کاروبار' کاریگری' ریڑھی لگانا یا اس قسم کا کوئی کام کرتا ہے جب اس کے

پاؤں ذرا جمنے لگتے ہیں تو وہ اپنے کنبے کو شہر میں بلا لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کے رشتہ داروں کی آمد کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے یہ آبادی ۸۰-۹۰ لاکھ نفوس تک جا پہنچی ہے' رات کو بیشمار لوگ فٹ پاتھوں اور باغوں میں سوتے ہیں اور شب خوابی کے لئے پولیس کو پیسے دیتے ہیں۔ بیشتر لوگ جو بیکار ہیں وہ داتا دربار کے لنگر سے مفت کھانا کھاتے ہیں۔ سارا دن سڑکوں میں روزگار کی تلاش میں پھرتے ہیں ۔ آپ صبح کے وقت شہر کے مختلف حصوں میں مزدوروں کے اڈوں پر چلے جائیں جہاں دیہاتوں سے آئے ہوئے لوگوں کی بہت بڑی تعداد جنہیں unskilled لیبر کہا جا سکتا ہے' اداس چہروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہے بڑے شہر دینت ہوتے ہیں جو بے سہارا کو بہت جلدی نگل لیتے ہیں۔ یہ لوگ ملتان' ویہاڑی' بہاولنگر' اوکاڑہ بلکہ پنجاب کے ہر گاؤں سے لاہور آگئے ہیں اس خیال سے کہ بڑے شہر میں کام ہوتا ہے۔ دوسری طرف دیہاتوں اور چھوٹے شہروں کا درمیانی طبقہ تعلیم نوکریوں اور کاروبار کے چکر میں آبسا ہے۔ لاہور میں روزانہ تین چار لاکھ افراد دوسرے شہروں سے کام کرنے آتے ہیں اور شام کو واپس اپنے شہروں میں چلے جاتے ہیں۔ آبادی کا اندازہ لگانے کے لئے مروجہ پیرامیٹر پندرہ سال سے کم عمر کے بچوں کی تعداد ہے۔ آپ لاہور کے کسی سڑک پر جہاں دو تین سکول ہیں پل بھر کے لئے رک کر دیکھیں بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد چیونٹیوں کی طرف چاروں طرف پھیلی ہوتی ہے۔ یہ صورتحال شہر کے ہر حصے میں ہے۔لاہور میں آبادی کے اس غیر معمولی ارتکاز سے سڑکیں تنگ ہو گئی ہیں ہیں' مکانوں کی قلت ہے' سکولوں میں داخلے کی جگہ نہیں' بسیں لوگوں سے ٹھسی ہوئی ہیں' ہسپتالوں میں مریض کاریڈوروں میں لیٹے ہوئے کسی طبی مدد کے بغیر کراہ رہے ہیں۔ چودہ کروڑ کی آبادی کا مفت علاج تو امریکہ جیسا ملک بھی نہیں کرا سکتا۔ پاکستان میں ہیلتھ انشورنس کا کوئی نظام نہیں ہے' ہر کوئی مفت علاج چاہتا ہے جو اتنی بڑی آبادی کو فراہم کرنا ناممکنات میں سے ہے۔اس ارتکاز آبادی سے مہنگائی اور انسانی استحصال

زوروں پر ہے۔ آبادی میں بے مہار اضافہ نہ صرف جرائم کے حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ ورکنگ کلاس میں ایک اور طبقے کو بھی پیدا کیا ہے۔لاہور کی تمام نئی بڑی آبادیوں کے گرد و نواح میں بے شمار خانہ بدوش خیمہ زن ہیں ان کے علاوہ بہت سی جگیوں کو بھی تعمیر کرلیا گیا ہے جن میں دیہاتوں کے بے آسرا خاندان آباد ہیں۔ اسی طرح ماڈل ٹاؤن سے کچھ دور قریباً تیس ہزار نفوس پر ایک اور آبادی معرض وجود میں آئی ہے جس میں زیادہ تعداد بچوں کی ہے۔ روزانہ بیس تیس ہزار کے قریب عورتیں اور بچے شہر کے مختلف علاقوں میں پھیل جاتے ہیں اور گھروں میں جز وقتی کام کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی دیہاتی عورتیں بچوں کی پوٹ لئے بڑی آبادیوں کے باہر مقیم ہیں جو کام کے دوران تین چار بچے ساتھ لاتی ہیں جو ان کے کام کے دوران چیخ و پکار کرتے رہتے ہیں' وہ ہر گھر میں دو گھنٹوں کے قریب کام کرتی ہیں' اس کے بعد اگلے گھر میں چلی جاتی ہیں' اس طرح شام تک وہ چھ سات گھروں میں کام کر کے تھکن سے چور ہو کر بچوں کے ساتھ واپس چلی جاتی ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ عورتیں ہیں جن کے خاوندوں نے دوسری شادی کرلی ہے یا وہ کام کاج نہیں کرتے' اور صرف بیوی کی کمائی پر انحصار کرتے ہیں۔ یہ محنت کش عورتیں منہ مانگی اجرت لیتی ہیں کیونکہ انہیں بھی معلوم ہے کہ لاہور کی نئی مڈل کلاس کی عورتیں کام چور اور status conscious عورتیں ہیں۔ یہ محنت کش عورتیں ان گھروں میں کام کے علاوہ کوئی اور تعلق استوار نہیں کرتیں' صرف طلب ہی ان کا واحد اصول حیات ہے۔ جو عورتیں بڑی آبادیوں کے قریب آباد صبح کے وقت کام کرتی ہیں اور رات کو تھکن سے چور بدن لئے پیشہ بھی کرتی ہیں اور وہ اس بات کو چھپاتی نہیں۔ یہ ایک بہت بڑا معاشی اور معاشرتی انقلاب ہے جو اس خاموشی سے ہمارے معاشرتی ڈھانچے میں چلا آیا ہے کہ ہمیں سوچ کی مہلت بھی نہیں ملی۔ اسی طرح ورکشاپوں میں لاتعداد نو عمر بچے کام کرتے ہیں جن کا تعلق زیادہ تر دیہاتی علاقوں سے ہے۔ شہر کے لاتعداد تنوروں یا چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں چلے جہاں

آدھے سے زیادہ آزاد کشمیر کی آبادی کام کرتی ہے۔ لاہور اجرتیوں کا شہر بن چکا ہے جس نے ہر طبقے کو سکیڑ کر اک گوشے میں دھکیل دیا ہے۔ دیہاتوں اور چھوٹے شہروں سے لوگ اس لئے بڑے شہروں میں ہجرت کرتے ہیں کہ ان کے علاقوں میں کوئی کاروبار نہیں ہے، کوئی صنعت نہیں ہے، کوئی ورکشاپیں نہیں ہیں، لوگ زیادہ تر مزارے ہیں یا ان کے رقبے اتنے چھوٹے ہیں کی بڑے کنبوں کی کفالت نہیں کر سکتے۔ میڈیا کی وجہ سے اب دیہاتی لوگوں بھی ضروریات شہری لوگوں ایسی ہیں جس کے لئے ہر دم کیش چاہئے ہے جو زمیندارے میں ممکن نہیں ہے کیونکہ انہیں فصل کی کٹائی کا انتظار کرنا پڑتا ہے چنانچہ وہ حاضر کیش چاہتے ہیں جو انہیں شہر میں ہی مل سکتا ہے۔

لاہور میں کثرت آبادی کی وجہ سے سڑکوں کو کشادہ کرنا پڑا، فٹ پاتھوں کا ملیا میٹ کر دیا گیا، بے شمار ویگنیں اور بسیں سڑکوں پر آگئیں، ہر گلی محلے اور سڑک پر ریڑھیوں اور خوانچہ فروشوں نے ڈیرے جما لئے ہیں، شہر کے کسی کونے کھدرے میں سواریاں پارک کرنے کی جگہ نہیں رہی ہے۔ انسانوں کے اس ہجوم میں شہر اپنی شخصیت کھو چکا ہے۔ لاہور کی اصل آبادی معدوم ہو چکی ہے۔ آبادی اور بیروزگاری لازم و ملزوم ہیں۔ شہر کے تمام علاقوں میں گداگروں کی بہتات ہے جو ہر عمر کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ عموماً ایک ہی عورت کے بیشمار بچے مختلف روپ دھارے گڑگڑاتے ہوئے انسانی رحم کو پکارتے ہیں، سڑکوں کو پر چھوٹے چھوٹے بچے شام کے اخبار بیچنے کے لئے چیختے ہیں۔ گداگر عورتیں اور بزرگ ہاتھوں میں ماچس کی ڈبیاں لئے بھیک مانگتے ہیں۔ ان مظاہر سے کم سے کم یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ غربت میں جنسی بھوک زیادہ لگتی ہے اور نادار لوگ زیادہ بچوں کی مدد سے زیادہ سے زیادہ بھیک اکٹھی کرتے ہیں۔ یہ دردناک مناظر سب دیکھتے ہیں۔

کثرت آبادی کا لاہور پر سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کی واقفیتیں ختم ہو گئی ہیں، کوئی کسی کو نہیں جانتا، کلچرل مشاغل ختم ہو گئے ہیں، بڑا سے بڑا نامور پر بھی

سڑک پر سے گزرے تو اسے کوئی شناخت نہیں کرتا کیونکہ اس وقت روٹی اور روٹی ہی مسئلہ رہ گیا ہے۔ یہ معاملہ صرف لاہور تک ہی نہیں محدود کراچی اور دوسرے بڑے شہروں کی حالت اس سے بھی زیادہ دگرگوں ہے۔ اگر ہر حکومت ضبط آبادی کے اعلانات سے ڈرتی ہے تو یہ کام NGOS اور خواندہ طبقے اور اخباری میڈیا کا ہے کہ وہ اس ملک کو آبادی کے حملے سے بچائے ۔ یہ ایسا ایٹم بم ہے جس پر پاکستانی معاشرہ بیٹھا خوشی سے تالیاں بجا رہا ہے۔

خوف کی دنیا

خوف انسانی زندگی کا ناگزیر حصہ ہے۔ بہادر سے بہادر آدمی بھی اس حالت سے دوچار ہوتا ہے۔ خوف کو محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی اصل کیفیت کو دوسرے تک منتقل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ انتہائی داخلی حالت ہوتی ہے جو اچانک فرد کو آلیتی ہے۔ بعض خوف بڑے واضح ہوتے ہیں جیسے موت کا خوف' دشمن کا خوف' شیر یا سانپ کا خوف۔ بعض خوف غیر واضح ہوتے ہیں جن کی ظاہری وجہ معلوم نہیں ہوتی مثلاً بند جگہوں کا خوف' اونچائی کا خوف پانی کا خوف وغیرہ۔ لیکن فرد بتدریج خوف کی ان کیفیات سے آشنا ہو جاتا ہے کہ اسے اونچائی پر نہیں جانا' اسے کھلے پانیوں سے دور رہنا۔ خوف کی تمام حالتوں میں ذاتی نقصان injury Personal کا احساس سب پر مقدم ہوتا ہے۔ خوف کسی متصورہ یا حقیقی نقصان کا پیشگی احساس ہوتا ہے۔

خوف کے مختلف محرکات ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ خوف کی دو قسمیں ہیں۔ خارجی اور داخلی خوف۔ خارجی خوف ایسی غیر معمولی صورتحال ہے جو خوف کے احساس کو پیدا کرتی ہے۔ داخلی خوف بعض دفعہ نفسیاتی ہوتا ہے اور بعض دفعہ مابعد الطبیعاتی اور مذہبی بھی ہو سکتا ہے۔ خوف عقلی اور غیر عقلی دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ غیر عقلی خوف عموماً بچپن کے زمانے میں اپنی جڑیں پکڑتا ہے اور اس کے دور رس نتائج ہوتے ہیں۔ خارجی خوف اس وقت شروع ہوتا ہے جب بچہ

جذباتی طور پر انے والدین سے علیحدگی محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ بچے جو یتیم ہو جاتے ہیں یا جن کا باپ بوجہ طلاق یا کسی دوسرے سبب خاندان کو چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے تو وہ باپ کی غیر موجودگی میں احساس کمتری' عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں جو ان کے اندر خوف کی دائمی حالت پیدا کرتے ہیں۔خوف situational ہوتا ہے اور صورتحال کی تبدیلی کے ساتھ اس کی نوعیت اور شدت بھی بدلتی رہتی ہے۔ بچپن میں جن بھوتوں کا خوف' برے خوابوں کا خوف بعض حالات میں دہشتdread کا پیدا ہونا اگر phobia کی شکل اختیار نہیں کر گیا ہو تا بلوغت اور عقلی رویے کی پرورش کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ خوف کی دو شکلیں ہیں اپنے آپ کا خوف اور دوسرے کا خوف۔ اپنے آپ کا خوف ان افراد میں زیادہ ہوتا ہے جو سوچ بچار کرتے ہیں یا جن میں نیوراتی رجحانات غالب ہوتے ہیں۔ یہ خوف کی انفرادی حالت ہے جس میں مذہب کا خوف اور گناہ کاخوف اور سب سے بڑھ کر اپنے فنا کا احساس بھی شامل ہوتا ہے۔ اپنے آپ کے خوف میں وہ مبتلا ہوتا ہے جو مقدر پر یقین نہیں رکھتا۔ ایک عام شخص یہ کہے گا کہ جو کچھ مقدر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔' اس لئے خوف سے وہ بچ نہیں سکتا۔ انسان ایک غیر متوقع جنس ہے جسے اپنے بارے میں زیادہ علم نہیں ہوتا' وہ کسی وقت بھی کچھ کرنے کا اہل ہے۔ مثال کے طور پر ایک نارمل دین دار شخص رات کو زہر آور گولیاں کھا کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے جبکہ اس کے شعور کی کسی سطح پر عدم اطمینان اور ایسا محرک موجود نہیں ہوتا جس نے اسے خودکشی پر مجبور کیا ہے۔ یہ بات حتمی ہے کہ کوئی فرد خوف کی حالت موروثی طور پر اپنے ساتھ لے کر نہیں آتا' اسے سب کچھ باہر سے ملتا ہے۔ خوف کو غیر عقلیirrationalحالت کہا جاتا ہے کیونکہ بہت کم خوف حقیقی اور عقلی ہوتے ہیں۔ دوسرے کا خوف اپنے سے خوف کی نسبت زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ پر اور دوسرے پر عدم تیقن کا نتیجہ ہوتا ہے۔۔

مغربی معاشروں نے علم اور سائنس کی ترقی کی وجہ سے زندگی میں عقلی رویوں

کو ترجیح دی ہے اس طرح انہوں نے بہت سے خوفوں سے نجات حاصل کر لی ہے۔
بیسویں صدی میں چاند پر جانے سے لے کر دوسری تمام خطرناک مہمات سفید فام لوگوں نے سرانجام دی ہیں۔ ان کے برعکس ایشائی ممالک اور خاص طور پر جنوبی ایشیا کے ممالک میں زندگی کے بہت سے معاملات میں خوف کی حکمرانی ہے۔خوف کا تعلق ہمارے زندگی کے پرسپشن سے ہے۔اگر ہم زندگی کو اسباب و علل کے رشتے میں بندھا ہوا دیکھتے ہیں تو بہت سے معاملات واضح ہو جاتے ہیں۔ وضاحت خوف کو ختم کرتی ہے۔ اس کے برعکس جنوبی ایشیا کے ممالک میں اور خاص طور پر پاکستان میں انسانی رشتوں کی بنیاد ایک دوسرے کی تعظیم کی بجائے خوف پر ہے۔ مذہبی سطح پر بھی سزا اور جزا کا تصور خوف پر مبنی ہے۔ ایک بدکار کو سزا کا خوف دیا جاتا ہے۔ ماں بچے کو باپ کی عزت کرنے کے لئے خوف دلاتی ہے' سکول کا ماسٹر سکول کا کام نہ کرنے پر اسے سزا کا خوف دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کاروبار زندگی میں بہت کم کام ترغیب کے ذریعے کروائے جاتے ہیں' عموماً سزا کا خوف ان معاشروں میں زیادہ کار گر ہوتا ہے جہاں معاشرتی انصاف اور **human dignity** کا فقدان ہوتا ہے۔معاشرتی اداروں کا کام زندگی کو آسان بنانا اور فرد میں یقین اور اعتماد پیدا کرنا ہے۔اس کے برعکس ہمارے یہاں ہر کوئی خوف کا شکار ہے۔ ہر فرد ریاستی مشینری اور اس کے اہلکاروں سے ڈرتا ہے' اپنے ہمسایوں سے ڈرتا ہے کہ کہیں وہ اس کی عورت کو یرغمال نہ بنا لے' باہر وہ دکان داروں سے بھی ڈرتا ہے کہ اگر اس نے کسی چیز کی قیمت پر اصرار کیا تو اسے بے عزت کر دیا جائے گا' اور تو اور لوگ دہشت گردوں کے خوف سے مساجد میں کم کم جانے لگے ہیں۔ کہنے کا مطلب ہے کہ ہم خوف کے معاشرے میں رہتے ہوئے اپنی ذات کا خوف بھول کر ایک دوسرے سے خائف رہتے ہیں اور یہی اندیشہ ہوتا ہے کسی وقت کوئی شخص سرعام آپ کی تذلیل کر سکتا ہے اسی طرح سرکاری دفتروں میں بھی افسر شاہی اور بے انتہا کرپشن نے عجیب وغیب خوف پیدا کیا ہوا ہے۔

جب معاشرے میں کھلم کھلا خوف کی حکمرانی ہو تو لوگ اس کے عادی ہو جاتے ہیں یا اپنے اندر سکڑ جاتے ہیں۔ خوف کی حالت میں فرد کا لب و لہجہ اور اس کا رد عمل تشویش اور عدم یقین کا ہوتا ہے۔ خوف مرد اور عورت کے تعلق میں بھی بعض خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ ہماری معاشرت میں مرد اور عورت کا تعلق چوری چھپے کا ہے جو اپنے ساتھ ایک احساس جرم لئے ہوتا ہے' احساس جرم خوف پیدا کرتا ہے۔اس طرح خوف ان میں ایک طرح کا حجاب پیدا کر دیتا ہے۔ حجاب ایک طرح کا امتناع ہے جو ابتدا ہی سے ہماری معاشرت بچے کے ذہن میں پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ مرد اور عورت میں تعلق کی بنیاد ہی امتناع اور خوف پر ہوتی ہے جو آگے جا کر جنسی عمل کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ خوف اضطراب پیدا کرتا ہے' اضطراب ایک داخلی کیفیت ہے جو ذہنی ارتکاز کو ختم کر دیتی ہے۔ عورت اور آدمی جب تنہائی میں ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں تو درمیان میں حجاب آ جاتا ہے جو اضطراب اور امتناع کا نتیجہ ہوتا ہے' اس حالت میں مرد کو intimacy کی حالت تک پہنچنے میں کافی دقت پیش آتی ہے' کبھی وہ برہنگی سے خائف ہوتا ہے' وہ آنکھ بھر کر عورت کے بدن کی تاب نہیں لا سکتا' کبھی سوچتا ہے کہ وہ جنسی عمل میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے اندر جنسی آمادگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے' یہ در اصل عورت کا خوف ہوتا ہے جو اس کا راستہ روک لیتا ہے۔ عورت کا خوف کئی طریقوں سے شخصیت میں در آتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ بچپن میں dominating ماں یا کسی ایسی عورت کا ہو جس سے اس کا کسی قسم کا رابطہ رہا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرد کمزور شخصیت کا مالک ہو جو پیش قدمی کے لئے دوسرے کا محتاج ہو۔جو لوگ دروں بیں ہوتے ہیں یا آدرش پسندی کا رجحان رکھتے ہیں انہیں اپنی annihilation کا خوف بھی ہوتا ہے جو کسی احساس یا کیفیت کے پیچھے چھپ کر ایک رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس حالت میں جنسی عمل ادھورا رہتا ہے جو سکون کی بجائے مزید اضطراب اور احساس کمتری کا موجب بنتا

ہے۔ خوف انفرادی نفسیات کا نتیجہ بھی ہوتے ہیں اور ماحول کی جبریت سے بھی در آتے ہیں۔ نفسیاتی صحت کے لئے فرد کو مختلف قسم کے تواہمات اور خدشات سے باہر نکالنا ضروری ہے کیونکہ خوف بتدریج دیمک کی طرح شخصیت کو کھا جاتا ہے اور اس کے اندر intiative کو معدوم کر دیتا ہے۔ انفرادی سطح پر تو اس کا علاج ممکن ہے لیکن اجتماعی سطح پر خوف پیدا کرنے والے عناصر اور قوتوں کو ایک بہتر نظام زندگی ختم کر سکتا ہے۔

عورتیں کے مردوں پر مظالم کی انوکھی کہانی

مظلوم عورت نہیں مرد ہے جو چکی پیستا ہے

☆

فلسفے کی تاریخ میں پہلا وجودی ناول

تہہ خانے سے

Notes from underground

دوستوفسکی

ترجمہ

انیس ناگی